وَ مَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور مجھے کیا ہوا کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾

کیا میں اسے چھوڑ کر (اور) معبود بناؤں کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی دکھ پہنچانے کا ارادہ کرے تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے بچا سکیں گے۔

اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

میں اس صورت میں یقیناً کھلی گمراہی میں ہوں گا۔

اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

میں تمہارے رب پر ایمان لایا۔ سو میری (بات) سنو۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

کہا گیا، جنت میں داخل ہو جا۔ اس نے کہا اے کاش میری قوم جانتی۔ (2740)

بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾

وہ جو میرے رب نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا۔

وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾

اور ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا اور نہ ہم کبھی اتارتے ہیں۔ (2741)

2740- ﴿قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ﴾ میں ایک قول تو یہ ہے کہ وہ زندہ جنت میں داخل ہوگا اور دوسرا یہ ہے کہ شہید ہو کر داخل جنت ہوا۔ اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ جنت اس کے لیے واجب ہوگئی۔ (ج) اور بعض نے مراد اس سے صرف بشارت لی ہے یعنی اسے جنت کی خوش خبری دی گئی۔ (د) اور یہ معنی لیے جائیں تو پھر موت کے وقت سے اس کی خصوصیت نہیں۔ بہتیرے لوگ ہیں جنہیں اس دنیا کی زندگی میں جنت کی بشارت مل جاتی ہے اور ہمارے نبی کریم ﷺ کے دس صحابی جو عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں مشہور ہیں اور اس کا اپنی قوم پر افسوس کرنا بظاہر اسی دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

2741- **اعدائے حق کی ہلاکت کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں اترتے:** ﴿مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ سے مراد اس کی موت لی گئی ہے۔ مگر

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾

وہ صرف ایک آواز ہوتی ہے۔ پس وہ ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔

وقف غفران يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾

ہائے افسوس بندوں پر کوئی رسول ان کے پاس نہیں آتا مگر وہ اس سے ہنسی کرتے ہیں۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾

کیا وہ غور نہیں کرتے کتنی نسلیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیں کہ وہ ان کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ (2742)

اس کے ایمان لانے کے بعد بھی مراد ہوسکتی ہے۔ کیونکہ ایمان لا کر وہ اپنی قوم سے نکل جاتا ہے اور قوم مخالفت پر اڑی رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دشمن حق قوم پر ہم آسمان سے لشکر نہیں اتارا کرتے بلکہ زمین سے ہی وہ اسباب پیدا ہوجاتے ہیں جو اس قوم کی تباہی کا موجب ہوجاتے ہیں خواہ وہ زلزلہ ہو یا آتش فشاں ہو یا آندھی ہو یا غرق ہو یا جنگ ہو۔ پہلے نبیوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا اور ہمارے نبی کریم ﷺ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ اور نزول ملائکہ جس کا ذکر جنگوں کے متعلق آتا ہے وہ صرف مومنوں کو قوت دینے اور دشمنوں کے دل میں رعب ڈالنے کے لیے تھا۔ دشمن کے مارنے کے لیے اوپر سے فرشتوں کے آنے کو یہ آیت غلط ٹھہراتی ہے، اس لیے لڑائیوں میں فرشتوں کا مقابلہ کرنا صحیح نہیں۔ اور اگلی آیت میں جو آتا ہے ﴿صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ تو یہ بھی سب کے لیے ہے۔ خود نبی کریم ﷺ کے اعداء کے متعلق آگے آتا ہے ﴿مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ [49] تو مراد اس سے عذاب کے متعلق حکم الٰہی ہے، خواہ کسی رنگ میں ہو۔ اور بعض نے ﴿جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾ سے مراد ملائکہ وحی لے کر یہ مطلب لیا ہے کہ اس کے بعد اس کی قوم پر نبوت کا دروازہ بند ہوگیا۔ مگر ایک مومن کے قتل ہونے پر اللہ تعالیٰ کا کسی قوم کو نبوت سے محروم کر دینا سمجھ نہیں آتا۔

2742- ﴿اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جنہیں ہلاک کر دیا گیا وہ ان کی طرف جو اسی دنیا میں رہ جاتے ہیں لوٹ کر نہیں آتے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ قیامت سے پہلے پھر زندہ ہو کر آئیں گے۔ آپ نے فرمایا پھر ہم بہت ہی برے لوگ ہیں کہ ان کی عورتوں سے نکاح یا اور ان کی میراث تقسیم کر لی۔ تب آپ نے پڑھا ﴿اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ (ر) اور بعض نے کہا اہل مکہ کی طرف لوٹ کر نہیں آتے، اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ ہم نے ان سے پہلے نسلوں کو اس لیے ہلاک کیا کہ وہ رسولوں کی طرف رجوع نہ کرتے تھے۔ دوسرے معنی کو ترجیح ہے۔

ع 2 20 1 وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع

اور کل ہاں سب کے سب ہی ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے۔

وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور ایک نشان ان کے لیے مردہ زمین ہے۔ ہم نے اسے زندہ کیا اور اس میں سے اناج نکالا تو وہ اس سے کھاتے ہیں۔

وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ۙ

اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس میں چشمے جاری کیے۔

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

تاکہ وہ اس کے پھل سے کھائیں اور ان کے ہاتھوں نے اسے نہیں بنایا۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے؟ (2743)

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

بے عیب (ذات) ہے جس نے سب جوڑے پیدا کیے اس سے جو زمین اگاتی ہے اور ان کی اپنی جانوں سے اور اس سے جو وہ نہیں جانتے۔ (2744)

2743- **عرب کی مردہ زمین کے زندہ ہونے میں نشان:** ان آیات سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کس طرح ہم آسمانی پانی کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کرتے رہتے ہیں اور اس میں اناج اور پھل نکالتے رہتے ہیں۔ اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو جو پہلے محض مردہ تھی نہ اس پر روئیدگی تھی، نہ کوئی جاندار تھا زندہ کیا۔ اور اس میں سارے سامان انسانوں کی روزی کے پیدا کیے اور اس کے اندر پانی کے چشمے بہائے۔ اسے برنگ نشان اس لیے بیان کیا کہ انسان کے لیے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمانیت سے پیدا کیا۔ انسان کے ہاتھوں نے یہ چیزیں نہیں بنائیں۔ اسی طرح وہ سامان جو انسان کی روحانی زندگی کا موجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو زندہ کر کے اس میں چشمے بہاتا اور پھل وغیرہ اگاتا ہے۔ ایسا ہی اب اس کی روحانی بارش سے عرب کی مُردہ زمین زندہ ہوجائے گی اور علوم کے چشمے بہہ نکلیں گے اور بڑے بڑے عظیم الشان انسان اس مردہ قوم میں سے پیدا ہوں گے۔ انسان کے ہاتھوں میں یہ طاقت نہ تھی کہ یہ کام کرتے۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے یہ کر دکھائے گا۔

2744- یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب **چیزوں کے جوڑے** پیدا کیے یہاں تک کہ سبزیوں کے بھی اور انسانوں کے، جس میں سب

وَ اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۖۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ﴿۳۷﴾

اور ایک نشان ان کے لیے رات ہے اس سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو ناگہاں وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ (2745)

وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾

اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے۔ (2746)

جاندار شامل ہیں۔ اور ﴿مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ بڑھا کر بتایا کہ ایسے بھی جوڑے ہیں جنہیں وہ نہیں جانتے۔ اس میں وہ سب چیزیں آجاتی ہیں جن کا علم انسان آہستہ آہستہ حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ جوڑوں کا ذکر اس لیے کیا کہ دنیا میں سب نشوونما جوڑوں سے ہی ہے۔ پس قوائے روحانی کی نشوونما کے لیے بھی کسی رنگ کی زوجیت چاہیے یعنی روحانی طور پر انسان ترقی نہیں کرسکتا جب تک اس کا تعلق کسی اور ہستی سے نہ ہو، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ جیسے دوسری جگہ ہے ﴿وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ﴾ [الذاریات: 49:51-50] ''اور ہر چیز سے ہم نے جوڑے پیدا کیے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ سو اللہ کی طرف دوڑو۔'' اور سبحان سے شروع اس لیے کیا کہ یہ تعلق اس قسم کا نہیں جیسے جسمانی ازواج میں ہوتے ہیں، بلکہ یہ روح کا تعلق ہے اور تمام عیبوں اور نقصوں سے پاک ہے۔ اور بتایا یہ ہے کہ تعلق باللہ سے تم میں روحانی نشوونما پیدا ہوگا۔

2745- **آنحضرت ﷺ کے ظہور سے پہلے دنیا پر ظلمت کا چھا جانا:** رات میں سے دن کو کھینچ کر نکال لینا (اور سَلَخَ کسی چیز کا چمڑا اتارنا ہے [دیکھو نمبر: 1176]) اس لیے فرمایا کہ پہلے ظلمت ہے اور نور گویا ایک لباس ہے جو اس کو تاریکی میں پہنایا جاتا ہے۔ جب وہ نور کا لباس اتار لیا جاتا ہے تو پھر اندھیرا ہی اندھیرا رہ جاتا ہے اور انسان کچھ کام نہیں کرسکتا۔ اور اس میں اشارہ یہ ہے کہ جب روحانی روشنی دنیا میں مفقود ہوجاتی ہے یعنی نور نبوت گم ہوجاتا ہے تو روحانی طور پر لوگ ظلمت میں رہ جاتے ہیں۔ جب تک وہ نور پھر نہ آئے اس وقت تک تاریکی دور نہیں ہوسکتی اور نہ روحانی ترقی کے لیے انسان سعی کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور بتایا ہے کہ دنیا میں اس وقت سب لوگ اندھیرے میں ہیں، کیونکہ پہلی نبوتوں کا نور گم ہو چکا، اس لیے اب طلوع آفتاب کی ضرورت ہے۔ اور اس آفتاب کے طلوع کا یہ نشان ہوگا کہ دنیا میں روحانی بیداری پیدا ہوجائے گی۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ دنیا میں جو تاریکی پھیل گئی تھی وہ آفتاب کی روشنی سے ہی دور ہوئی اور تمام مذاہب کے اندر اصلاحات اسلام کے اصول سے ہی پیدا ہوئیں۔

2746- ﴿مُسْتَقَرٌّ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 960]۔ **سورج کے مستقر سے مراد** اس کا انتہائے سیر بھی لیا گیا ہے۔ اور سائنس سے آج یہ ثابت ہے کہ یہ کل نظام شمسی جس کا مرکز سورج ہے ایک اور عظیم الشان ستارے کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ اور بعض نے مراد مشرق اور مغرب میں اس کے انتہائی طلوع اور غروب کی جگہ کو لیا ہے اور بعض نے ظرف زمان لے کر مطلب یہ لیا ہے کہ ایک

وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾

اور چاند کے لیے ہم نے کئی منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ وہ پھر کھجور کی پرانی سوکھی ہوئی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ (2747)

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

نہ سورج کو حاصل ہے کہ چاند کی غایت کو پہنچے اور نہ رات دن سے آگے نکلنے والی ہے اور سب (اپنے اپنے) دائرے میں چل رہے ہیں۔ (2748)

وقت تک چلتا ہے، یعنی قیامت کے قائم ہونے تک۔ اور یہ جو حدیث میں ہے کہ آفتاب کا مستقر عرش کے نیچے ہے تو خدا کا عرش ایک خاص جگہ کا نام نہیں، بلکہ اس کے نفاذ قدرت کی طرف اس میں اشارہ ہے۔ پس آفتاب کا مستقر عرش کے نیچے ہونا یا اس کا سجدہ کرنا صرف یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں، بلکہ اس کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

2747- ﴿كَالْعُرْجُوْنِ﴾ عُرْجُوْنٌ کھجور کی شاخ کو یا خصوصیت سے اس شاخ کو کہا جاتا ہے جو خشک ہو کر ٹیڑھی ہو جائے۔ (ل)

﴿الْقَدِيْمِ﴾ قِدَمٌ۔ حُدُوْث کے خلاف ہے۔ (ل) اور قِدَمٌ گزشتہ زمانہ میں موجود ہونا اور بَقَاءٌ آئندہ میں موجود ہونا۔ اور قَدِيْمٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفات میں قرآن شریف میں یا آثار صحیحہ میں نہیں آیا۔ (غ)

2748- ﴿يَنْۢبَغِيْ﴾ بَغْيٌ کے اصل معنی تو تجاوز ہیں اور اس کا اکثر استعمال مذموم ہے یعنی بری بات کی طرف تجاوز۔ مگر بعض وقت اچھے موقعہ پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے عدل سے احسان کی طرف تجاوز پر یا فرض سے نفل کی طرف تجاوز پر۔ ﴿يَنْۢبَغِيْ﴾ بھی دو طرح پر ہے۔ ایک جب وہ چیز ایک فعل کے لیے مسخر ہوگئی جیسے [اَلنَّارُ يَنْۢبَغِيْ اَنْ تَحْرَقَ الثَّوْبَ] اور دوسرے جب ایک چیز میں اہلیت ہو جیسے [فُلَانٌ يَنْۢبَغِيْ اَنْ يُّعْطِيَ الْكَرَمِهِ] (اور یہاں) اور ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ [69] میں پہلے معنی میں ہے۔

سیاروں کا اپنے دوائر میں گردش کرنا:

سورج چاند کی غایت کو نہیں پہنچ سکتا یعنی جو کام چاند کا ہے وہ سورج نہیں دے سکتا۔ ہر ایک کے سپرد اللہ تعالیٰ نے الگ الگ کام کیا ہے۔ رات دن سے آگے نہیں نکل سکتی یعنی جب دن آجاتا ہے تو رات باقی نہیں رہ سکتی، اپنا کام کر کے وہ دور ہو جاتی ہے۔ اور سورج اور چاند دو پر کیا منحصر ہے، سب سیارے اپنے اپنے دائروں میں چل رہے ہیں۔ سَبَّحَ کا لفظ چونکہ سیال چیز میں تیرنے پر بولا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سب اجرام سماوی کسی ٹھوس چیز پر نہیں بلکہ پانی یا ہوا کی طرح کسی رقیق چیز میں گردش کر رہی ہیں۔ اور یہاں یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب جب آفتاب نبوت طلوع ہو گیا تو رات باقی نہیں رہ سکتی۔ اور

وَ اٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور ایک نشان ان کے لیے یہ ہے کہ ہم ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں اٹھاتے ہیں۔

وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور ان کے لیے اس جیسا کچھ اور پیدا کیا جس پر وہ سوار ہوتے ہیں۔ (2749)

وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں۔ تو ان کے لیے نہ کوئی فریاد رس نہ ہوگا اور نہ وہ بچائے جائیں گے۔

قرآن سے ظلمت کا دور ہونا ہی اس کی حقانیت کا کافی نشان ہے۔

2749- **کشتیوں والی قوم:** ﴿الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ سے مراد بعض نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی لی ہے اور ﴿مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ سے اور کشتیاں جن پر لوگ سوار ہوتے ہیں جو گویا حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے نمونہ پر بنی ہیں۔ لیکن ﴿حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ میں ذکر ان لوگوں کا ہے جو مخاطب قرآن ہیں۔ اس لیے دوسرے معنی یعنی یہ کہ فُلْكِ اسم جنس ہے صحیح ہیں اور دوسرے معنی بھی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد وغیرھما سے مروی ہیں۔ اور ﴿مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ سے مراد کشتی کی مانند کوئی اور چیز ہے، اور کہا گیا ہے کہ اونٹ ہیں۔ (ج) کیونکہ وہ گویا [سَفَائِنُ الْبَرِّ] ہیں یعنی خشکی کی کشتیاں۔ لیکن یوں تو انسان گھوڑوں، ہاتھیوں پر بھی سوار ہوتے ہیں، اونٹ کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ فرمایا: ﴿وَّ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا﴾ [النحل: 8:16] ''اور گھوڑے اور خچریں اور گدھے (پیدا کیے) تاکہ تم ان پر سوار ہو۔'' اور کشتی سے مماثلت صرف اس بات میں ہونا کہ اس پر سواری کی جاتی ہے درست نہیں۔ میرے نزدیک اس میں اشارہ ہوائی کشتیوں یا ہوائی جہازوں کی طرف ہے اور وہی آبی کشتیوں کی مثل کہلا سکتے ہیں۔ اور ﴿خَلَقْنَا﴾ اس لیے فرمایا کہ جو چیز انسان اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے سامانوں سے بناتا ہے اس کا بنانا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہوسکتا ہے۔ اور کشتی اللہ تعالیٰ کے تصرفات عظیمہ میں سے ہونے کے لحاظ سے اور انسانوں کے لیے موجب منفعت ہونے کے لحاظ سے نشان ہے ﴿وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ﴾ [البقرة: 164:2] ''اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں کہ اس کے ساتھ لوگوں کو نفع دے۔'' اور اگلی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ذکر ایک خاص قوم کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کشتیوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے بہت کچھ عطا فرمائے گا، لیکن وہ ایک وقت کے لیے ہوگا۔ اور اگر وہ قبول حق سے انکار کریں گے تو انہیں غرق کر دیا جائے گا۔ ﴿رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾﴾ اور یہ کہ یہاں ذکر عرب کا نہیں، دو باتوں سے ظاہر ہے۔ ایک تو ﴿الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ سے ان کا بہت ہی کم تعلق تھا اور دوسرے ﴿مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ کوئی اور چیز ان کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ اور قرآن کریم میں یہ بسا اوقات ہوتا ہے کہ آئندہ زمانہ کے واقعات کی طرف بطور

اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾

مگر ہماری طرف سے رحمت اور ایک وقت تک سامان ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس سے بچاؤ کرلو جو تمہارے سامنے ہے اور جو تمہارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (2750)

وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور ان کے پاس کوئی پیغام اپنے رب کے پیغاموں میں سے نہیں آتا مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾

اور جب انہیں کہا جاتا ہے اس میں سے خرچ کرو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔ تو جو کافر ہیں وہ انہیں جو ایمان لائے کہتے ہیں کیا ہم اسے کھانا دیں، جسے اگر اللہ چاہتا تو کھانا دیتا۔ تم کھلی غلطی میں ہو۔ (2751)

پیشگوئی اشارہ کیا جاتا ہے۔

2750- مفسرین کے ﴿اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ﴾ میں کئی اقوال ہیں مثلاً ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ﴾ سے مراد اُمم سابقہ کا عذاب لیا ہے اور ﴿مَا خَلْفَكُمْ﴾ سے مراد عذاب آخرت یا ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ﴾ جو پہلے گناہ کر چکے اور ﴿مَا خَلْفَكُمْ﴾ جو آئندہ کریں گے۔ ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ﴾ وہ مکروہات جن کا انہیں فکر ہے اور ﴿مَا خَلْفَكُمْ﴾ وہ مکروہات جن کا انہیں گمان بھی نہیں۔ (ر) لیکن ﴿اتَّقُوْا﴾ کے معنی نگہداشت حقوق لے کر جیسے ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ﴾ [النسآء: 1:4] ''اور اللہ کے (حقوق کی) جس کے ذریعہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کی نگہداشت کرو۔'' میں ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ﴾ سے مراد وہ باتیں ہیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں اور ﴿مَا خَلْفَكُمْ﴾ وہ جو پس پردہ ہیں۔ یا وہ حقوق جو امور ظاہری سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ جو امور باطنی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ مومنوں کی طرف سے جواب بھی ہوسکتا ہے۔

2751- جہلائے مکہ اگر یہ جواب دیتے تھے کہ جسے خدا نے نہیں دیا ہم اسے کیوں دیں، تو اس سے بدتر حالت آج بڑی بڑی مہذب قوموں کی ہے۔ جو قومیں سامان دنیا سے محروم ہیں وہ جو کچھ ان کے پاس ہے اسے بھی لینا چاہتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان کا

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور کہتے ہیں، یہ وعدہ کب ہے؟ اگر تم سچے ہو۔

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَ هُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾

وہ کسی چیز کا انتظار نہیں کرتے مگر ایک آواز کا جو انہیں پکڑ لے گی اور وہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ (2752)

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّ لَاۤ اِلٰۤى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع 3 18 2

پس نہ وہ وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور صور پھونکا جائے گا۔ پس وہ ناگہاں قبروں سے (نکل کر) اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ (2753)

ہاتھ پکڑ کر انہیں مشکلات سے باہر نکالیں۔

2752- ﴿يَخِصِّمُوْنَ﴾ اصل میں يَخْتَصِمُوْنَ ہے اور اِخْتِصَامٌ اور تَخَاصَمَ باہم جھگڑنا ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ **﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ کا سوال عذاب دنیا کے لیے آتا ہے**۔ کیونکہ یہاں عذاب دنیا کا ذکر ہے جو انہیں جھگڑتے ہوئے آلے گا اور وہ وصیت بھی نہ کر سکیں گے۔ اور جھگڑنے سے مراد یہ ہے کہ امور دنیا اور تجارت میں ان کا اس قدر انہماک ہوگا کہ باہم جھگڑ رہے ہوں گے اور آنے والے عذاب کی طرف خیال بھی نہ ہوگا [يَتَخَاصَمُوْنَ وَ يَتَنَازِعُوْنَ فِيْ مُعَامَلَاتِهِمْ وَ مُتَاجُرِهِمْ]۔ (د) آج یورپ کے باہم جھگڑے بعید نہیں کہ کسی ایسے ہی عذاب کا پیش خیمہ ہوں جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

2753- ﴿اَلْاَجْدَاثِ﴾ اَجْدَاثٍ جَدَثٌ کی جمع ہے جس کے معنی قبر ہیں ﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾ [المعارج: 43:70] ''جس دن وہ قبروں سے نکل پڑیں گے دوڑتے ہوئے۔'' (غ) قبروں سے نکل پڑنے سے مراد اس حالت سے نکلنا ہے جس میں وہ بعد موت ہیں۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ کہیں گے ہم پر افسوس۔کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھایا؟ یہ وہ ہے جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ وہ صرف ایک ہی آواز ہوگی تو وہ سب کے سب ہمارے حضور حاضر ہو جائیں گے۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّ لَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾ سو آج کسی جان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں کچھ بدلہ نہ ملے گا، مگر اسی کا جو تم کرتے تھے۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ جنت والے اس دن ایک کام میں لگے ہوئے خوش ہوں گے۔(2754)

2754- ﴿شُغُلٍ﴾ شَغْلٌ اور شُغْلٌ اور شُغُلٌ کوئی پیش آنے والی بات ہے جو انسان کی توجہ کو دوسری طرف ہٹا دے۔(غ) گویا وہ اس وقت دوسری سب باتوں سے اہم ہے۔اور یہ کمال مسرت سے بھی ہوسکتا ہے اور کمال تکلیف سے بھی، اور یہاں کمال مسرت مراد ہے۔(ر)

﴿فٰكِهُوْنَ﴾ فَاكِهَةٌ سب پھلوں کو کہتے ہیں ﴿وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾ [الواقعة: 20:56] ''اور میوہ جیسا وہ پسند کریں گے۔'' اور فَوَاكِهُ جمع ہے ﴿وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ [المرسلات: 42:77] ''اور پھلوں میں جن کو وہ چاہیں۔'' اور فَوَاكَهَةٌ اُنس والوں کے ساتھ باتیں کرنا ہے۔(غ) اور فَكِهَ وہ ہے جو پھل کھاتا ہے اور فَاكِهٌ وہ جس کے پاس پھل ہوں اور مزاح کرنے والے کو بھی کہتے ہیں۔جیسا کہ نبی ﷺ کی صفت میں ہے [مِنْ اَفْكَهِ النَّاسِ مَعَ صَبِيٍّ] (مسند البزار، جلد2، صفحہ286 حديث: 6441) یعنی بچوں کے ساتھ بہت مزاح کرنے والے تھے۔اور سیدنا زید بن ثابت ؓ کی حدیث میں ہے [مِنْ اَفْكَهِ النَّاسِ إِذَا خَلاَ مَعَ اَهْلِهِ] (مصنف ابن ابی شيبة، كتاب الادب، باب ما ذكِر فِي حسنِ الخلقِ وكراهِيةِ الفحشِ، حديث: 25837) یعنی جب اپنی بی بی کے ساتھ تنہائی میں ہوتے تو بہت مزاح کرنے والے ہوتے تھے۔اور تَفَكَّهَ کے معنی ہیں اس نے تعجب کیا ﴿فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ﴾ [الواقعة: 65:56] ''تو تم تعجب کرنے لگو۔'' اور یہاں معنی نادم ہونا بھی کیے گئے ہیں۔اور ﴿فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ﴾ [الطور: 18:52] ''اپنے رب کے دیئے پر خوش ہوں گے۔'' میں معنی نعمت والے خوش ہونے والے اور یہی معنی یہاں ہیں۔اور فَكِهَ فخر کرنے والے اکڑباز کو کہا جاتا ہے۔

هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ | وہ اور ان کے جوڑے سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے۔

لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّ لَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ | ان کے لیے اس میں پھل ہوگا اور ان کے لیے ہوگا جو وہ مانگیں گے۔(2755)

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾ | سلامتی رحم کرنے والے رب کی طرف سے قول ہوگا۔

وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ | اور اے مجرمو! آج جدا ہو جاؤ۔(2756)

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ | اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمہیں حکم نہیں دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

وقف غفران

وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ | اور کہ میری عبادت کرو، یہ سیدھا رستہ ہے۔

(ل) ﴿وَ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾﴾ [المطففين: 31:83] ''اور جب اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ کر جاتے (تو) اتراتے ہوئے لوٹتے۔''

2755- ﴿يَدَّعُوْنَ﴾ اِدِّعَاءٌ یہ ہے کہ ایک چیز کو طلب کرے کہ وہ اس کے لیے ہے ﴿وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ﴾ [حٰمٓ السجدة: 31:41] ''اور تمہارے لیے اس میں (وہ سب کچھ) ہے جو تم مانگو۔'' یعنی جو تم مانگو۔ اور دَعْوٰی اِدِّعَاءٌ کو بھی کہتے ہیں ﴿فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ﴾ [الأعراف: 5:7] ''سو ان کی پکار جب ہمارا عذاب ان پر آیا۔'' اور دعاء یا پکار کو بھی ﴿وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾﴾ [يونس: 10:10] ''اور ان کی آخری دعا ہے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔'' (غ)

2756- ﴿امْتَازُوْا﴾ مَازَ کے معنی دو چیزوں کو الگ الگ کیا اور اِمْتَازَ اور تَمَيَّزَ اس کے لیے بطور مطاوع کے ہیں یعنی ایک چیز یا الگ ہو گئی یا کٹ گئی۔ ﴿تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ﴾ [الملك: 8:67] ''قریب ہے کہ جوش سے پھٹ پڑے۔'' (غ)

وَ لَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور یقیناً اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کیا۔ تو کیا تم عقل سے کام نہ لیتے تھے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾

یہ وہ دوزخ ہے جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہے۔

اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

آج اس میں داخل ہو جاؤ، اس کے بدلے جو تم کفر کرتے تھے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے، جو وہ کماتے تھے۔ (2757)

وَ لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا دیں پھر وہ رستے کے آگے بڑھیں تو کس طرح دیکھیں گے۔

2757- **مونہوں پر مہر لگانے سے مراد** یہ ہے کہ کلام نہ کریں گے۔ (ر) اس قسم کی آیات میں بتایا ہے کہ دوسرے عالم کی کیفیات الگ رنگ کی ہیں۔ انسان کلام تو منہ سے کرتا ہے مگر وہاں منہ سے کلام نہیں ہوگا، کیونکہ وہاں عمل کے نتائج ظاہر ہوں گے اور وہ اظہار کلام نہیں بلکہ انسان کی حالت سے ہوگا۔ یہاں **ہاتھوں کے کلام** کرنے اور پاؤں کے گواہی دینے کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ ہے ﴿شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [حٰمٓ السجدة: 20:41] ''ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم ان کے خلاف ان کے عملوں کی گواہی دیں گے۔'' کان اور آنکھیں اور چمڑے گواہی دیں گے۔ چنانچہ تفاسیر میں یہ بھی منقول ہے: [شَهَادَتِهَا دَلَالَتِهَا عَلٰى أَفْعَالِهَا وَظُهُوْرِ آثَارِ الْمَعَاصِيْ عَلَيْهَا بِأَنَّ يُبَدِّلَ اللهِ تَعَالٰى هَيْآتِهَا بِأُخْرٰى يَفْهَمُ مِنْهَا اَهْلَ الْحَشْرِ وَيَسْتَدِلُّوْنَ بِهَا عَلٰى مَا صَدَرَ مِنْهُمْ فَجُعِلَتِ الدَّلَالَةِ الْحَالِيَةُ بِمَنْزِلَةِ الْمُقَالِيَةُ مَجَازًا] ''ان (کان، آنکھ) کی گواہی ان کے افعال اور معاصی کے خلاف دلیل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان کی صورت کو کسی دوسری صورت میں بدل دے گا جس سے اہل حشر سمجھ جائیں گے۔ اور جو ان سے معلوم ہوتا ہے وہ اس سے استدلال لیں گے۔ اس حالت کی تبدیلی کو مجازی طور پر بات کرنے کی دلیل کے طور پر لیا جائے گا۔'' (ر)

وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہ پر مسخ کر دیں، پھر وہ نہ آگے چل سکیں گے اور نہ لوٹ سکیں گے۔ (2758)

وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں اسے بناوٹ میں اوندھا کر دیتے ہیں۔ تو کیا یہ عقل سے کام نہیں لیتے؟ (2759)

2758- مَسَخْنَا۔ مَسخ خَلق اور خُلق کا بگاڑنا ہے اور ان کا ایک صورت سے دوسری صورت میں بدل دینا۔ اور بعض حکماء کا قول ہے کہ مسخ دو طرح پر ہے۔ ایک مسخ خَلق جو صورت میں ہو اور دوسرا مسخ خُلق جو ہر زمانہ میں ہوتا رہتا ہے۔ یعنی انسان بعض اخلاق ذمیمہ کو جو بعض حیوانات سے تعلق رکھتے ہیں حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً شدت حرص میں کتے کی طرح ہو جانا وغیرہ اور ﴿وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾ [المائدة: 60:5] ''اور ان میں سے بندر اور سور بنائے۔'' میں جو دو وجوہ ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اور یہاں ﴿لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ﴾ دونوں وجوہ کو اپنے اندر رکھتا ہے۔ گو اول زیادہ صاف ہے۔ (غ) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ﴾ کے معنی مروی ہیں [لَاَهْلَكْنَاهُمْ فِيْ مَسَاكِنِهِم]۔ (ج) ہم انہیں اپنے گھروں میں ہلاک کر دیں گے۔ اور حسن کہتے ہیں ہم انہیں گھروں میں بٹھا دیتے۔ (ج)

﴿مُضِيًّا﴾ مُضِيّ اور مَضَاء کے معنی نفاذ ہیں اور اس کا استعمال اجسام اور معانی دونوں میں ہوتا ہے ﴿مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [الزخرف: 8:43] ''پہلوں کی مثال گزر چکی۔'' ﴿فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [الأنفال: 38:8] ''تو پہلوں کا معاملہ گزر ہی چکا ہے۔'' (غ)

یہ تو ظاہر ہے کہ دونوں آیتیں اس دنیا کی حالت کے متعلق ہیں۔ یعنی اگر اللہ چاہتا تو دنیا میں ایسا کر دیتا [فَالظَّاهِرُ أَنَّ هٰذَا وَكَذَا مَا قَبْلِهِ لَوْ كَانَ لَكَانَ فِي الدُّنْيَا]۔ (ر) آیا مراد اس سے ظاہر طور پر ایسا کر دینا ہے؟ یعنی واقعی آنکھوں کا نور لے جانا اور صورتوں کا مسخ کر دینا، تو یہ ہوا نہیں۔ پھر اس کے ذکر کا کیا فائدہ تھا؟ لیکن اگر دونوں باتوں کو روحانی رنگ میں لیا جائے تو بعض لوگوں کی ان میں سے یہ حالت ہو بھی گئی اور مَسْخٍ کے جو معنی روایات میں ہیں ان کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں روحانی رنگ میں ہی ہیں۔

2759- بظاہر اس آیت کا یہاں تعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ جزا و سزا کا ذکر تھا اور یہاں ایک قانون بتایا کہ جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں آخر اس کی قوت کو ضعف سے بدل دیتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے۔ بات یہ ہے کہ اصل ذکر قرآن حکیم میں **قوموں کے عروج و زوال** کا چلتا ہے گو اکثر لوگ اس نظر سے قرآن شریف کو نہیں پڑھتے۔ اس سورت میں بھی بعض قوموں کی تکذیب قرآن کا ذکر ہے۔ تو اس لیے اپنا ایک قانون بتاتا ہے کہ جو قوم دنیا میں لمبی عمر پاتی اور ترقی کرتی ہے آخر اس پر قانون قدرت کے مطابق وہ زمانہ آتا ہے کہ قوت کی بجائے ضعف پیدا ہو کر زوال کی حالت نمودار ہوتی ہے۔ اور یہ توجہ دلائی ہے کہ قوم کی

وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ﴿۶۹﴾

اور ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا اور نہ اسے یہ شایاں ہے۔ یہ صرف نصیحت اور کھول کر بیان کرنے والا قرآن ہے۔ (2760)

حالت کو انسان کی حالت پر قیاس کرلو یا گزشتہ قوموں کے حالات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بڑا بڑا اقبال حاصل کر کے اور لمبے زمانہ تک عروج پا کر آخر وہ مٹ گئیں۔ پس قرآن کریم کی مخالفت کرنے والے کہاں باقی رہ سکتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس قانون کے ماتحت مسلمانوں کی بھی آخر وہی حالت ہونی چاہیے تو یہ صحیح ہے۔ فرق یہ ہے کہ جب ایک مسلمان قوم زوال کی طرف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک دوسری قوم کو اس کی جگہ کھڑا کر دیتا ہے۔ اس لیے عربوں پر زوال آ سکتا ہے، ایرانیوں پر آ سکتا ہے، ہندیوں پر آ سکتا ہے، ترکوں پر آ سکتا ہے مگر **اسلام پر نہیں آ سکتا**۔ اسلام بعض اصولوں کا نام ہے، اگر اصول صحیح ہیں تو وہ آخر دنیا تک رہیں گے۔ ہاں ان سے فائدہ اٹھانے میں کبھی ایک قوم گوئے سبقت لے جائے گی کبھی دوسری۔ آج بھی اسلام کے مخالف اپنے لمبے عروج پر فخر نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کے قانون لاتبدیل ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ ان الفاظ میں یہ بھی اشارہ ہو کہ انسان کا جسم ترقی کے بعد انحطاط کی طرف جاتا ہے، مگر اس کی روح اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کر کے ہمیشہ ترقی کرتی ہے اور اس کی **غیر متناہی ترقیات** ہی اسے دوسری زندگی کے لیے باقی رکھتی ہیں۔

2760- **شعر اور نصیحت:** یہ مضمون بھی بے تعلق نہیں۔ بظاہر یہ قانون کہ جسے لمبی عمر ملتی ہے وہ بناوٹ میں اوندھا بھی ہوتا ہے، یعنی ضعف کے بعد قوت اور قوت کے بعد ضعف ہے، ایک شاعرانہ تخیل رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تو فرمایا کہ یہ شاعرانہ تخیل نہیں، یہ نصیحت ہے تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں اور اصول صحیحہ کو قبول کرلیں۔ اور چونکہ سورت کی ابتدا اس سے کی تھی کہ قرآن حکمت والی کتاب ہے اور اس کے اصول علمی ہیں اس لیے بھی بتایا کہ شاعرانہ بلند پروازیاں نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے اصول کو اعلیٰ درجہ کے کلام میں بیان کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ اور شاعری:

آنحضرت ﷺ کا شعر نہ جاننا ایک تاریخی امر ہے۔ آپ جس زمانہ میں پیدا ہوئے وہ عرب میں شاعری کے عروج کا زمانہ تھا، لیکن آپ کی طبیعت کو شعر سے ادنیٰ مناسبت بھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ روایات میں ہے کہ اگر کبھی آپ بطور مثال کوئی شعر پڑھتے تو اس کے اول کو آخر اور آخر کو اول کر دیتے۔ (ج) [كَفَى بِالشَّيْبِ وَالْإِسْلامِ لِلْمَرْءِ نَاهِيًا] کو آپ ﷺ نے پڑھا [كَفَى بِالْإِسْلامِ وَالشَّيْبِ لِلْمَرْءِ نَاهِيًا] (کنزالعمال فی سنن اقوال، جلد7، صفحہ148، حدیث:18452) تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شعر نہیں سکھایا۔ (ر) یعنی شاعر نے کہا تھا کہ بڑھاپا اور اسلام انسان کو بدی سے روکنے کے لیے کافی ہیں۔ اور آپ نے اسلام کو مقدم کر کے یوں ادا کیا کہ اسلام اور بڑھاپا انسان کو بدی سے روکنے کے لیے کافی ہیں۔ گو وزن قائم نہ رہا۔ اگر آپ کا کلام اشعار میں ہوتا تو کہا جا سکتا تھا

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾

تا کہ اسے ڈرائے جو زندہ ہے اور کافروں پر حجت قائم ہو۔ (2761)

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾

کیا وہ غور نہیں کرتے کہ ہم نے ان کے لیے اس سے جو ہمارے ہاتھوں نے بنایا چار پائے پیدا کیے ہیں۔ سو وہ ان کے مالک ہیں۔

وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَ مِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور ہم نے انہیں ان کا مطیع کر دیا۔ پس ان میں سے ان کی سواری ہے اور ان میں سے وہ کھاتے ہیں۔ (2762)

کہ اس زمانہ میں وہ ملک بڑے بڑے شاعر پیدا کر رہا تھا ایک شاعر کا خیال اس طرف چلا گیا کہ اخلاقی اور روحانی مضامین پر شعر کہے۔ مگر آنحضرت ﷺ کی آمد نے بالکل کایا پلٹ دی۔ اتنے اعلیٰ درجہ کے مضامین بیان فرمائے جو شاعروں کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے تھے، مگر شعر کا نام تک نہیں جانتے۔ اور سارا کلام نثر میں ہے جس سے عرب اب تک قریباً نا آشنا تھے۔ یہ بجائے خود ایک اعجاز تھا۔ یہ سوال ہوا ہے کہ آیا شعر کا نہ جاننا آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی یا دیگر انبیاء بھی ایسے ہی تھے، تفاسیر میں دونوں قول ہیں۔ ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی نبی بھی شاعر نہیں ہوا، ہاں شعر کہہ لینا دوسری بات ہے۔ لیکن چونکہ شعر کا اثر عارضی ہوتا ہے اور آپ کا پیغام دائمی تھا جس نے ہمیشہ کے لیے دنیا کو اٹھانا تھا، اس لیے پیرایہ شعری سے آپ کے کلام کو بالکل پاک رکھا گیا۔

مگر تعجب یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کو اس پیرایہ میں یہ سمجھایا گیا تھا کہ وہ بھی **شعروشاعری** کی طرف کم مائل ہوں، یہ بیماری مسلمانوں میں خاص زور پکڑ گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ عملی حالت روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی۔ بہت سے مسلمان بادشاہوں نے بجائے اس کے کہ علوم کو ترقی دیتے شاعروں کو بڑے بڑے انعامات دے کر شاعری کو ترقی دی۔ اور آج بھی مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ کہیں مشاعرہ ہو، کسی جلسہ میں نظم پڑھی جانی ہو، پیر و جوان سب کام چھوڑ کر بھاگے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی وعظ و نصیحت کی مجلس ہو، قرآن حکیم کی درس و تدریس کا سلسلہ ہو تو الا ماشاء اللہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔

2761- ﴿حَيًّا﴾ حَيّ اور حَيٰوةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 79] میں موت کی تشریح اور یہاں معنی حَيُّ الْقَلْبُ ہیں (یعنی جس کا دل زندہ ہے) جو عقل سے کام لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مردہ دل نہیں اور کند ذہن نہیں۔ (ج)

مطلب یہ ہے کہ جو شخص کچھ بھی عقل سے کام لیتا ہے وہ تو قرآن کی نصیحت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جو کفر پر اڑے ہوئے ہیں ان کو احساس ہی کوئی نہیں۔

2762- ﴿ذَلَّلْنٰهَا﴾ ذَلَّلْنَا۔ ذُلٌّ سے ہے [دیکھو نمبر: 97] اور تَذْلِيْلٌ کے معنی منقاد یا مطیع کرنا اور ﴿وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾﴾

وَ لَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور ان کے لیے ان میں فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں۔ تو کیا یہ شکر نہیں کرتے؟(2763)

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ ؕ

اور اللہ کے سوائے معبود بناتے ہیں تا کہ انہیں مدد ملے۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

وہ ان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ ان کے لیے ایک لشکر ہے، حاضر کیے گئے۔(2764)

وقف لازم

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

سو ان کی بات تجھے غمگین نہ کرے۔ ہم جانتے ہیں جو یہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔

اَوَ لَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ

کیا انسان غور نہیں کرتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا۔

[الدھر: 14:76] ''اور اس کے پھل ان کے لیے سہولت سے میسر آنے والے بنائے گئے ہیں۔'' میں مراد ہے سُهِّلَتْ یعنی ان کے لیے سہولت سے میسر آنے والے بنائے گئے۔ ﴿فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا﴾ [النحل: 69:16] ''اپنے رب کے رستوں پر فرمانبرداری سے چلی جا۔'' میں ذُلُلٌ کے معنی فرمانبردار ہیں۔

2763- ﴿مَشَارِبُ﴾ مَشْرَبٌ کی جمع ہے اور یہ مصدر بھی ہے (جیسے یہاں)۔ اور پینے سے مراد یہاں دودھ وغیرہ ہے اور اسم مکان بھی، جیسے ﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ [البقرة: 60:2] ''سب قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا۔'' اور اسم زمان بھی۔ (غ)

﴿مَنَافِعُ﴾ سے مراد سوائے سواری اور کھانے اور دودھ کے دیگر فوائد ہیں، جیسے ان سے دوسرے کام لینا یا ان کے چمڑے، ہڈیاں وغیرہ۔

2764- ﴿هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ﴾ یعنی مشرک اپنے معبودوں کے لیے حاضر کیا گیا لشکر ہے۔ اور حاضر کیے گئے سے مراد ان کی حفاظت کے لیے حاضر ہونا یا تیار رہنا ہے، اور یہ معنی قتادہ سے مروی ہیں۔ (ر) پس یہاں کھلی پیشگوئی ہے کہ باوجود ساری طاقت ان بتوں کی حمایت میں صرف کرنے کے یہ مغلوب ہوں گے اور بت ان کی کچھ بھی مدد نہ کر سکیں گے۔ اور بعض نے ﴿مُّحْضَرُوْنَ﴾ سے مراد قیامت کے دن عذاب میں حاضر ہونا لیا ہے۔

نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾

پھر دیکھو وہ کھلا جھگڑا کرنے والا ہے۔

وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾

اور ہمارے لیے ایک نادر بات بیان کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ کہتا ہے کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب وہ گل چکی ہوں گے؟(2765)

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۙ﴿۷۹﴾

کہہ، انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار بنایا۔ اور وہ ہر پیدائش کو خوب جاننے والا ہے۔(2766)

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

وہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ بنائی، تو دیکھو تم اس سے جلاتے ہو۔(2767)

2765- ﴿ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا﴾ یعنی ہماری شان میں ایک عجیب بات بیان کرتا ہے جو اپنی ندرت میں مثل کی طرح ہے اور وہ احیائے موتی ہے۔ (ر) ﴿رَمِيْمٌ﴾ رَمَّ پرانی چیز کی اصلاح کرنا اور رِمَّةٌ بوسیدہ ہڈیوں سے مخصوص ہے۔ اور یہی معنی ﴿رَمِيْمٌ﴾ کے ہیں ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝﴾ [الذاریات: 42:51] ''وہ کسی چیز کو نہ چھوڑتی تھی جس پر آتی تھی مگر اسے چورا کر دیتی تھی۔'' (غ) اور حدیث میں ہے کہ آپ نے گوبر اور رِمَّةٌ یعنی بوسیدہ ہڈی کے ساتھ استنجا کرنے سے منع کیا۔

احیائے موتی کے انکار کو یوں ظاہر کیا کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ مطلب یہ نہیں کہ گوشت تو زندہ ہو سکتا ہے اور بوسیدہ ہڈیاں زندہ نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ احیا کے استبعاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گوشت تو ایک طرف رہا جب ہماری ہڈیاں تک بھی گل جائیں گی اور ہمارا کچھ باقی نہ رہ جائے گا تو پھر احیا یا زندہ نظر آنا کس طرح ہوگا۔ اور گویہ انکار احیائے موتی پر ہے، لیکن اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کام جو اس وقت تک ایک مردہ حالت میں نظر آتا ہے وہ زندہ کس طرح ہوگا۔ آج بھی لوگ اسلام کو ایک مردہ حالت میں سمجھتے اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ کس طرح زندہ ہوگا۔ کیا عجیب جواب ہے، جس نے پہلے زندہ کیا وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔

2766- ﴿يُحْيِيْهَا﴾ اور ﴿اَنْشَاَهَآ﴾ میں ضمیر نفس کی طرف ہوگی جو پچھلی آیت سے مفہوم ہے۔ اور ﴿بِكُلِّ خَلْقٍ﴾ بتاتا ہے کہ یہ پیدائش اس پیدائش سے بالکل الگ ہے۔ وہ جس نے پہلی پیدائش کی اور اس سے واقف ہے، وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ **دوسری خلق** کس طرح ہوگی۔

2767- **سبز درخت سے آگ کا ہونا** اس لحاظ سے تو ظاہر ہی ہے کہ لکڑی آگ کے لیے ایندھن کا کام دیتی ہے۔ مگر یہاں اس مضمون کا کیا

اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۗ وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ وقف غفران

کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ ان (انسانوں) کی مثل بنا سکے؟ ہاں اور وہ بڑا پیدا کرنے والا جاننے والا ہے۔(2768)

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾

اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے صرف یہی ہوتا ہے کہ اسے کہتا ہے ہو جا، سو وہ ہو جاتی ہے۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع 5/16/4

سو پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔(2769)

تعلق ہے؟ محض اتنی بات کہ سبز درخت جس میں اجزائے ماہیت ہیں اس سے آگ پیدا کرنا قدرت پر دال ہے۔ اور ایک قدرت سے دوسری قدرت پر استدلال ہے اس لیے صحیح نہیں کہ ان دونوں باتوں میں کوئی مناسبت بھی چاہیے۔ اور لفظ ﴿الْاَخْضَرِ﴾ کو ساتھ رکھنا بتاتا ہے کہ یہ ایندھن کی طرف اشارہ نہیں جو خشک لکڑی سے ہوتا ہے۔ مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سبز درخت بھی آپس میں رگڑ کھا کر آگ کو پیدا کرتے ہیں جو ایک تیسری چیز ہے، جس کا وجود ان درختوں میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ایک انسان کے انسان کامل کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے اور دو روحوں کے باہم رگڑ کھانے سے ایک نئی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم کے متعدد مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار اشارہ کیا ہے وہ ایک بالکل نئی زندگی ہے جس کا تعلق اعمال انسانی سے ہے جو تعلق باللہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے دوزخیوں کے لیے باوجود بعثت کے یہ زندگی نہیں ﴿لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾﴾ [طٰهٰ: 20:74] ''وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔'' ہاں وہ بھی اس دوسری زندگی کو ان آلائشوں سے پاک صاف ہونے کے بعد پالیں گے جن میں تعلق باللہ کے توڑنے سے وہ ملوث ہو گئے ہیں۔

2768- ﴿مِثْلَهُمْ﴾ میں ضمیر انسانوں کی طرف جاتی ہے جو ذوی العقول ہیں۔ یعنی وہ خدا جس نے آسمانوں اور زمین کی اتنی بڑی مخلوق کو پیدا کیا، کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ انسانوں جیسی ہستیوں کو جو اس وسیع مخلوق کے سامنے کچھ بھی پیدا نہیں کر سکے اور ﴿مِثْلَهُمْ﴾ کہہ کر یہ بھی صاف بتا دیا کہ وہ یہی انسان نہیں ہوں گے ان کی مثل ہوں گے۔

2769- ﴿مَلَكُوْتُ﴾ کے لفظ میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ جس حق کی تکذیب ہو رہی ہے آخر اس کی حکومت دنیا میں ہو گی۔

سورۃ الصافات

نام:

اس سورت کا نام الصّٰفّٰتِ ہے اور اس میں 5 رکوع اور 182 آیتیں ہیں اور اس کا نام اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔ جہاں خدا کے حضور صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید پر بطور نشان یا دلیل پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ جو اللہ کے حضور صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور ذکر الٰہی کرتے ہیں یہ آخر کار غالب ہوں گے اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں برباد نہ کر سکے گی۔

خلاصہ مضمون:

① سب سے پہلے رکوع میں توحید کے آخری غلبہ کا بیان ہے اور اس کے رستہ میں جس قدر رکاوٹیں ہیں ان کے دور کیا جانے کا ذکر ہے۔

② دوسرے رکوع میں موحدین اور مشرکین کے انجام کا ذکر اور مقابلہ کیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے رکوع اور پانچویں رکوع کے شروع میں بتایا ہے کہ پہلے رسولوں کا بھی اسی طرح مقابلہ کیا مگر جتنے اللہ کو مصیبت کے وقت پکارنے والے راستباز بندے ہوئے ہیں سبھی کو اللہ تعالیٰ نے مصائب سے نجات دی اور کامیاب کر کے پیچھے آنے والے لوگوں کے لیے انہیں ہادی راہ بنایا اور ان کا ذکر جمیل آنے والی نسلوں میں باقی رکھا۔

③ چنانچہ تیسرے رکوع میں حضرت نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا ذکر بھی ہے۔

④ چوتھے رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کا ذکر ہے۔

⑤ اور پانچویں رکوع کے شروع میں حضرت یونس علیہ السلام کا اور اسی پانچویں رکوع میں نہایت صفائی سے یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر کار مظفر و منصور ہوں گے، اور مومنوں کو ان کے مخالفوں پر غالب کیا جائے گا۔

تعلق و زمانۂ نزول:

جب پچھلی سورت میں انسان کامل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا ذکر کیا تو اس میں آپؐ کے اور آپؐ کے ساتھیوں اور ان کے ذریعہ سے توحید کے آخری غلبہ کا ذکر کیا۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور اس مجموعہ کی باقی سورتوں سے بلحاظ نزول کسی قدر پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔

اٰیَاتُھَا 182 (37) سُوْرَۃُ الصّٰفّٰتِ مَکِّیَّۃٌ (56) رُکُوْعَاتُھَا 5

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
المنزل 6 وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾	گواہ ہیں صف باندھنے والی (جماعتیں) قطاروں میں۔
فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾	پھر روکنے والی (جماعتیں) روکتی ہوئی۔
فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ۙ﴿۳﴾	پھر نصیحت کی پیروی کرنے والی (جماعتیں)۔
اِنَّ اِلٰـھَکُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾	تمہارا معبود یقیناً ایک ہی ہے۔(2770)

2770- ﴿الصّٰفّٰتِ﴾ صَافَّۃٌ کی جمع ہے۔جس سے مراد صف باندھنے والی جماعت ہے۔اور صَفّ قرآن میں مُصَلّٰی ہے یعنی جائے نماز۔کیونکہ لوگ وہاں صف باندھتے ہیں ﴿ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا﴾ [طٰہٰ: 64:20] ''پھر صف باندھ کر آؤ۔'' ازہری کہتے ہیں اس مقام پر آؤ جہاں تم اپنی عید اور نماز کے لیے جمع ہوتے ہو۔کیونکہ [اِئْتِ الصَّفَّ] کے معنی ہیں نماز کی جگہ آؤ۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے معنی ہوں صف باندھ کر آؤ۔ ﴿وَ عُرِضُوْا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا﴾ [الکھف: 48:18] ''اور وہ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کیے جائیں گے۔'' میں یہ بھی جائز ہے کہ سب ایک ہی صف میں ہوں اور ایسے موقع پر جمع بھی مراد ہوتی ہے۔(ل)

﴿فَالزّٰجِرٰتِ﴾۔زَجْرٌ آواز کے ساتھ دور کرنا ہے۔پھر کبھی اس کا استعمال آواز پر ہوتا ہے اور کبھی دور کرنے پر ﴿اِنَّمَا ھِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ﴾ [النازعات: 13:79] ''وہ صرف ایک ڈانٹ ہوگی۔'' ﴿مَجْنُوْنٌ وَّ ازْدُجِرَ﴾ [القمر: 9:54] ''دیوانہ ہے اور (اسے) ڈانٹا گیا۔'' یا دھتکارا گیا۔اور ﴿مَا فِیْہِ مُزْدَجَرٌ﴾ [القمر: 4:54] ''جن میں تنبیہ ہے۔'' میں مُزْدَجَرٌ سے مراد گناہوں کے ارتکاب سے روکنا اور دور کرنا۔(غ) اور زَجْرٌ کے معنی منع کرنا اور روکنا ہیں۔اور حدیث میں جہاں زَجْرٌ ہے اس کے معنی نَہِی یعنی روکنا ہیں۔اور حدیث عزل میں ہے [کَاَنَّہٗ زَجَرَ] یعنی گویا آپ نے اس سے روک دیا۔(ل)

﴿فَالتّٰلِیٰتِ﴾ تَالِیْ کے معنی تلاوت کرنا یا پیروی کرنے والا [دیکھو نمبر: 67] اور ﴿فَالتّٰلِیٰتِ﴾ ایسی جماعتیں۔

توحید الٰہی پر راستبازوں اور مومنین کی شہادت:

یہاں جن چیزوں کی قسم کھائی ہے بالفاظ دیگر جنہیں بطور گواہ پیش کیا ہے [دیکھو نمبر: 2729] وہ صف باندھنے والی، روکنے والی، تلاوت قرآن کرنے والی جماعتیں ہیں۔اور جواب قسم یا وہ امر جس کی وہ شہادت ادا کرتے ہیں یہ ہے کہ معبود ایک ہی ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ۵ آسمانوں اور زمین کا ربّ اور جو کچھ ان دنوں کے درمیان ہے اور مشرقی زمینوں کا ربّ۔ (2771)

عموماً مفسرین نے مراد اس سے ملائکہ لیے ہیں اور ایسے ہی بعض اور موقعوں پر بھی فرشتے مراد لیے ہیں اور یہ معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ ملائکہ خود غیر مرئی ہستیاں ہیں اور انہیں بطور شہادت پیش کرنا درست نہیں ہوسکتا۔ اور دوسرے تلاوت ذکر کا لفظ فرشتوں پر صادق نہیں آسکتا، مومنین پر ہی آسکتا ہے۔ چنانچہ قتادہ سے ﴿فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ۙ﴾ کے معنی میں یہی روایت ہے [مَایُتْلٰی عَلَیْکُمْ فِی الْقُرْاٰنِ] (ج) [بَنُوْ اٰدَمَ یَتْلُوْنَ کِتَابِهٖ تَعَالٰی] (ر) اور اگر تیسری آیت میں مومنین مراد لیے جائیں تو پہلی دو آیتوں میں بھی وہی مراد ہونے چاہئیں۔ اور ﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴾ میں مراد نماز میں صف باندھنے والے لوگ ہیں اور ﴿فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴾ میں لوگوں کو معاصی سے روکنے والے اور ﴿فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ۙ﴾ میں خود اتباع ذکر کرنے والے۔ اور پھر ان کی شہادت دو طرح پر ہے۔ ایک تو یہ کہ جتنی اس قسم کی جماعتیں دنیا میں ہوئی ہیں یعنی انبیاء اور مصلحین اور ان کے اتباع وہ دنیا میں کہیں بھی ہوئے ہوں اور کسی زمانہ میں ہوئے ہوں سب کے سب توحید الٰہی پر شہادت دیتے ہیں۔ یعنی تمام راستبازوں کی جماعتوں کی شہادت یہی ہے کہ خدا ایک ہے اور دوسرے رنگ میں یہ شہادت بطور پیشگوئی ہے، کیونکہ یہ سورت تو اس وقت کی ہے جب مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کمال پر ہے۔ تو گویا بتایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی سے اس ملک میں جماعتوں کی جماعتیں ایسی پیدا ہو جائیں گی جو خدا کے حضور نمازوں میں صفیں باندھ کر کھڑی ہوں گی اور ان کا کام دوسرے لوگوں کو معاصی سے روکنا اور خود اتباع قرآن کرنا ہوگا۔ اور ایک ملک عرب سے کیا خاص ہے، یہی شہادت آئندہ کل دنیا بھی ادا کرے گی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿الصّٰٓفّٰتِ﴾ سے مراد جنگ میں صفیں باندھنے والے اور ﴿فَالزّٰجِرٰتِ﴾ سے مراد دشمن کو روکنے والے ہوں یا گھوڑوں کو چلانے والے۔ اور اس صورت میں بھی یہ پیشگوئی ہے کہ حق اور باطل کا مقابلہ ہو کر آخر حق غالب آئے گا، معبودان باطل نیست و نابود ہو جائیں گے اور ایک خدا کا نام لیا جائے گا۔ اور ان دونوں معنوں کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔ دیکھو روح المعانی۔

2771- **مشرقی ممالک اور روحانیت:** ﴿رَبُّ الْمَشَارِقِ﴾ میں مَشَارِقْ سے مراد عموماً طلوع آفتاب کے مختلف نقطے لیے گئے ہیں، مگر اس سے مراد مشرقی سرزمینیں بھی ہوسکتی ہیں۔ اور گو ایسے موقعہ پر ایک کا نام لینے سے دونوں مراد ہوتے ہیں اور ﴿رَبُّ الْمَشَارِقِ﴾ سے مراد [رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ] ہی ہے۔ لیکن لفظ مَشَارِقْ خاص طور پر اختیار کرنے میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ روحانی تربیت میں مشرق فائق رہا ہے۔ چنانچہ انبیاء اور راستباز اکثر مشرقی ممالک میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ آفتاب روحانیت کا طلوع جب ہوا مشرق سے ہی ہوا اور توحید الٰہی کا غلغلہ ہمیشہ مشرق میں ہی بلند رہا اور مغرب ہمیشہ مادیات اور جسمانیات کا دلدادہ ہی رہا ہے اور روحانیت میں مشرق کا دست نگر رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جسے خدا خدا کر کے پکارا جاتا ہے وہ بھی صرف ایک مشرقی انسان ہی تھا۔ اور شاید اس میں بھی یہ اشارہ ہے کہ اب جو دنیا کی ربوبیت روحانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ۙ﴿٦﴾
ہم نے ورلے آسمان کو (عجیب) زینت (یعنی) ستاروں سے آراستہ کیا ہے۔ (2772)

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ﴿٧﴾
اور ہر سرکش شیطان سے (ان کی) حفاظت کی ہے۔ (2773)

لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ وَيُقْذَفُونَ مِن كُلِّ جَانِبٍ ﴿٨﴾
وہ اعلیٰ درجے کے گروہ کی باتیں نہیں سن سکتے اور ہر طرف سے ملامت کیے جاتے ہیں۔

دُحُورًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ﴿٩﴾
دھتکارے ہوئے اور (یہ) دُکھ ان کو لگا ہوا ہے۔ (2774)

ذریعہ کی جاتی ہے تو اول اس کا عروج مشرقی ممالک میں ہی ہوگا۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا کہ صداقت روحانی کو پہلے وہی لوگ قبول کرتے جن کو روحانیت سے تعلق زیادہ رہا ہے اور مغربی لوگ ایک وقت تک بوجہ اپنی مادہ پرستی کے اس سے محروم رہتے۔ اور اس زمانہ میں اس لفظ میں بالخصوص مسلمانوں کے لیے بڑی بھاری تسلی ہے۔ کیونکہ اہل مغرب مسلمانوں اور اہل مشرق کو ایسا سمجھتے ہیں کہ گویا وہ اس خدا کے پیدا کیے ہوئے انسان ہی نہیں جس نے اہل مغرب کو پیدا کیا، اور وہ محض اہل مغرب کی خدمت کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

2772- اس ظاہری زینت میں اشارہ ہے کہ عالم روحانیت میں بھی بعض وجود اس عالم کی زینت کا موجب ہوجاتے ہیں اور دوسرے نفوس کے لیے روشنی کا موجب ہوجاتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ] (جامع الرسول فی احادیث الرسول، جلد8، صفحہ556، حدیث: 6369) میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ اور ﴿السَّمَاءَ الدُّنْيَا﴾ سے مراد وہ بلندی ہے جو ہماری حدنگاہ ہے۔

2773- ﴿حِفْظًا﴾ فعل محذوف کا مفعول ہے [حِفِظْنٰهَا حِفْظًا]۔ آسمان کے شیاطین سے محفوظ ہونے سے کیا مراد ہے؟ [دیکھو نمبر: 1679] اور شیطان مارد سے مراد یہاں کاہن وغیرہ ہی ہیں جو ستاروں سے علم غیب حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے تھے، اور ان کا ذکر ان راستبازوں کے مقابل پر کیا ہے جن کا اوپر ذکر تھا۔

2774- [دیکھو نمبر: 1679] یہ کاہن وغیرہ مَلَاءِ اَعْلٰی کی باتیں نہیں سنتے اور ﴿الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ﴾ سے مراد ملائکہ ہیں یا اشراف ملائکہ۔ (ر) مطلب یہ کہ وہ جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہم غیب کی باتیں معلوم کرتے ہیں تو یہ بالکل جھوٹ ہے وہاں تک ان کی رسائی نہیں نہ وہ سن سکتے ہیں۔ اور ﴿يُقْذَفُونَ مِن كُلِّ جَانِبٍ ﴿٨﴾ دُحُورًا﴾ میں جو یہ مراد لی گئی ہے کہ ان پر آسمان کی چاروں جہات سے

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ⑩

سوائے اس کے کہ جو ایک (آدھ) دفعہ اچک لے جائے۔ تو اس کے پیچھے روشن انگارا آتا ہے۔ (2775)

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ⑪

تو ان سے پوچھ کیا ان کا بنانا زیادہ مشکل ہے یا وہ خلقت جو ہم نے بنائی، ہم نے انہیں مضبوط مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (2776)

انگارے پھینکے جاتے ہیں تو یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اگر ظاہری شہاب مراد لیے جائیں تو ان کا چاروں طرف سے پھینکا جانا شاذ و نادر ہی وقوع میں آتا ہے۔ اور یہاں مراد اس لیے بھی نہیں کہ اگلی آیت میں ہے ﴿اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ⑩﴾ پس یہاں شہاب ثاقب مراد نہیں۔ قَذْفٌ کے معنی ملامت بھی ہیں [دیکھو نمبر: 3062] اور یہ ملامت ان پر اس لیے ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے سب لوگ حتی کہ ان کے معتقد بھی ان پر ملامت کرتے ہیں اور عذاب لازماً یا تو یہی ہے اور یا مراد عذاب آخرت ہے یعنی دنیا میں یوں ذلیل ہوتے ہیں کہ ان کی باتیں جھوٹی نکلتی ہیں تو ملامت ہوتی ہے اور آخرت کا عذاب الگ ہے۔

2775- ﴿ثَاقِبٌ﴾ ثَقْبٌ سوراخ کرنا ہے اور ﴿ثَاقِبٌ﴾ وہ ہے جو اپنی روشنی کے ساتھ اس چیز میں کھب جائے جس پر وہ واقع ہو۔ ﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ﴾ [الطارق: 3:86] ''چمکتا ہوا ستارہ ہے۔'' (غ)

شیطان سے مراد:

چونکہ اوپر ذکر تھا کہ ان کی باتیں جھوٹ ہونے کی وجہ سے ہر جانب سے ان پر ملامت ہوتی ہے اس لیے یہاں بتایا کہ کبھی کبھار کوئی بات ان کی سچ بھی نکل آتی ہے اور اس کو جلدی سے اچک لے جانے سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی یہ بھی ایسی بات نہیں ہوتی جس سے معلوم ہو کہ اس سرچشمۂ غیب تک اسے کوئی دسترس ہے۔ بلکہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی جلدی سے کوئی چیز اچک لے جائے۔ شہاب ثاقب کے اس کے پیچھے آنے سے کیا مراد ہے؟ [دیکھو نمبر: 1679] جہاں مفصل بحث گزر چکی ہے۔ ﴿مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ﴾ سے یہ مراد نہیں کہ ملاء اعلیٰ سے کچھ باتیں سن بھی آتے ہیں اس کی تردید ﴿لَا يَسَّمَّعُوْنَ﴾ میں صاف موجود ہے۔ اور دوسری جگہ بھی ﴿اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝﴾ [الشعرآء: 212:26] ''وہ (وحی الٰہی کے) سننے سے دور کر دیئے گئے ہیں۔'' ﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ﴾ [الطور: 38:52] ''کیا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہے جس سے سن لیتے ہیں۔''

2776- ﴿لَّازِبٍ﴾ [لَزَبَ الشَّيْءُ] اس کا بعض بعض میں داخل ہو گیا۔ اور [لَزَبَ الطِّيْنِ] مٹی چمٹ گئی اور سخت ہو گئی۔ اور ﴿طِيْنٍ لَّازِبٍ﴾ چمٹ جانے والی مٹی ہے اور لَازِبٌ اور لَازِمٌ ایک ہی معنی میں ہے اور لَازِمٌ بمعنی ثابت بھی ہے۔ (ل)

﴿هُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا﴾ یہ تو ظاہر ہے کہ مَنْ ذوی العقول کے لیے ہے اور اس لیے دوسری جگہ جو آتا ہے ﴿ءَاَنْتُمْ

بَلْ عَجِبْتَ وَ يَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ بلکہ تو تعجب کرتا ہے اور وہ ہنسی کرتے ہیں۔ (2777)

وَ اِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے نصیحت قبول نہیں کرتے۔

وَ اِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ اور جب کوئی نشان دیکھتے ہیں ہنسی اڑاتے ہیں۔ (2778)

وَ قَالُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ اور کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر کھلا جادو ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم ضرور دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔

اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی۔

قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ کہہ، ہاں اور تم ذلیل (بھی) ہو گے۔ (2779)

اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ﴾ [النازعات: 27:79] ''کیا پیدائش میں تم زیادہ سخت ہو یا آسمان!'' تو یہاں ﴿مَّنْ خَلَقْنَا﴾ سے مراد سَمَاء نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ﴿مَّنْ خَلَقْنَا﴾ میں ایسا ذکر ہونا چاہیے جو ظاہر ہو اور یہ فی الحقیقت وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا یعنی نمازوں کو قائم کرنے والے، بدیوں کو روکنے والے، قرآن کریم کی پیروی کرنے والے۔ ان کے مقابل پر کاہنوں کا ذکر کیا تھا جو اس وقت ملک عرب کے روحانی پیشوا تھے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں قائم یہ جماعت رہ سکتی ہے جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے یعنی راستبازوں کی جماعت یا یہ لوگ یعنی کاہن وغیرہ۔ مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ نیکی کے مقابل پر یہ کہانت وغیرہ اب ملک عرب میں نہیں رہ سکتی اور باطل کی ساری فوجیں توحید کے مقابل پر نیست و نابود کر دی جائیں گی اور چمٹ جانے والی مٹی سے ان راستبازوں کو پیدا کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ **ثابت و قائم** رہیں گے۔

2777- یعنی تُو بوجہ اپنی شدت معرفت کے ان کے انکار پر تعجب کرتا ہے اور وہ بسبب اپنی جہالت کے ہنسی کرتے ہیں۔ (غ) عَجِبْ کے لیے [دیکھو نمبر:263]

2778- ﴿يَّسْتَسْخِرُوْنَ﴾ باب استفعال کا استعمال یہاں یا تو مبالغہ کے لیے ہے اور یا مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کو تمسخر کی طرف بلاتے ہیں۔ (ر)

2779- یعنی تم صرف اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لیے مبعوث ہی نہیں ہو گے بلکہ اس دنیا میں بھی مغلوب اور ذلیل ہو گے۔ یہ بھی ابتدائی سورتوں میں **کفار کی آخری** مغلوبیت کی ایک کھلی پیشگوئی ہے۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿١٩﴾

وہ صرف ایک ہی للکار ہے۔ سو وہ ناگہاں دیکھنے لگیں گے۔

وَ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿٢٠﴾

اور کہیں گے ہم پر افسوس، یہ جزا کا دن ہے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢١﴾ ع 1 21 5

یہ فیصلہ کا دن ہے، جسے تم جھٹلاتے تھے۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿٢٢﴾ لا

اکٹھا کرو انہیں جو ظلم کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو اور انہیں جن کی وہ اللہ کے سوائے عبادت کرتے تھے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿٢٣﴾ ج

پھر انہیں دوزخ کے رستہ کی طرف لے جاؤ۔ (2779) ل

وَ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ﴿٢٤﴾ لا

اور انہیں ٹھہراؤ کہ ان سے پوچھا جائے گا۔

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿٢٥﴾

تمہیں کیا ہوا تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿٢٦﴾

بلکہ وہ اس دن فرمانبردار ہوں گے۔

2779 ل- ﴿اَزْوَاجَهُمْ﴾ ازواج یا زوج کے لیے [دیکھو نمبر: 39 ل] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں [يَعْنِي اِتْبَاعَهُمْ وَ مِنْ اَشْبِهَهُمْ مِنَ الظُّلْمَةِ] (ج) یعنی اس سے مراد ان کے پیرو ہیں اور جو ظالموں میں سے ان کے مشابہ ہیں۔ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے اس کے معنی اَمْثَالَهُمْ مروی ہیں۔ (ر) یعنی ان کی مثل۔ اور ﴿مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ﴾ سے مراد سب معبودانِ باطل لیے گئے ہیں۔ لیکن آگے جو سوال و جواب آیا ہے کہ بعض بعض سے کہیں گے کہ تم نے ہمیں گمراہ کیا اور وہ کہیں گے ہم نے زبردستی تمہیں کسی راہ پر نہیں ڈالا، تم خود کفر کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ﴾ سے مراد یہاں ان کے وہ سردار ہیں جن کے پیچھے وہ آنکھیں بند کر کے چلتے تھے اور دوزخ کی طرف لے جایا جانا بھی انہی کے حق میں درست ہو سکتا ہے نہ ملائکہ اور مسیح وغیرہ کے حق میں۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے پوچھنے لگیں گے۔

قَالُوْۤا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾

کہیں گے تم بڑے زور سے ہمارے پاس آتے تھے۔

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾ۚ

(دوسرے) کہیں گے بلکہ تم (خود ہی) مومن نہ تھے۔

وَ مَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾

اور ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، بلکہ تم خود سرکش لوگ تھے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾

سو ہمارے رب کی بات ہم پر پوری ہوئی ہمیں ضرور مزا چکھنا ہوگا۔

فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾

پس ہم نے تمہیں گمراہی کی طرف بلایا کیونکہ ہم خود گمراہ تھے۔

فَاِنَّهُمْ يَوْمَىٕذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

سو وہ اس دن عذاب میں شریک ہوں گے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾

ایسا ہی ہم مجرموں سے (معاملہ) کرتے ہیں۔

اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾ۙ

یہ ایسے تھے کہ جب انہیں کہا جاتا کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں، اکڑتے تھے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿۳۶﴾ؕ

اور کہتے، کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک مجنون شاعر کی خاطر چھوڑ دیں؟

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ صَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۷﴾

بلکہ وہ حق لے کر آیا اور رسولوں کی تصدیق کی۔

اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ۚ

تم یقیناً دردناک عذاب چکھو گے۔

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾ اور تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر وہی جو تم کرتے تھے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ مگر اللہ کے مخلص بندے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾ ان کے لیے رزق ہے جس کی خبر دی گئی ہے۔[2780]

فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ (یعنی) پھل اور وہ باعزت۔

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۴۳﴾ نعمتوں والے باغوں میں۔

عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۴﴾ تختوں پر آمنے سامنے ہوں گے۔[2781]

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۴۵﴾ ان میں ایک پیالہ پھرایا جائے گا[2782] صاف پانی کا (شراب)۔[2783]

بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾ سفید، پینے والوں کے لیے لذت والا۔

2780- ﴿رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ کیا ہے؟ خود اگلی آیت میں بتا دیا ﴿فَوَاكِهُ﴾ یعنی پھل ہیں۔ اور ﴿فٰكِهِيْنَ﴾ نعمتوں کے حاصل کرنے والے ہیں۔[دیکھو نمبر: 2754] پس یہ پھل درحقیقت نعماء کے قائمقام ہیں اور ان کو پھل اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ اعمال کے ثمرات ہیں۔ اور وہ معلوم اسی لحاظ سے ہے کہ اس کی خبر دی گئی ہے۔ ورنہ اس کی کیفیات کا کوئی علم انسانوں کو نہیں دیا گیا۔ [دیکھو نمبر: 2622]

2781- ﴿مُتَقٰبِلِيْنَ﴾ مُقَابَلَةٌ اور تَقَابُلٌ یہ ہے کہ ایک دوسرے کی طرف آگے بڑھیں خواہ ذات سے یا توجہ سے یا محبت سے۔ ﴿مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ﴾ [الواقعة: 16:56] ''ان پر تکیے لگائے ہوئے آمنے سامنے (ہوں گے۔)'' (غ) اور یہاں ان کے تقابل سے ان کے ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ (ر)

2782- ﴿كَاْسٍ﴾ برتن کو کہتے ہیں مع اس کے جو اس میں پینے کی چیز ہو۔ اور ان دونوں میں سے ہر ایک کو علیحدہ بھی کہا جاتا ہے ﴿مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۚ﴾ [الدهر: 5:76] ''جس کی ملونی کافور ہے۔'' (غ) مَعِيْنٍ کے لیے [دیکھو نمبر: 2271]

2783- ﴿لَذَّةٍ﴾ لَذَّةٍ نقیض الم (درد) ہے۔ اور [لَذَّ بِهٖ يَلَذُّ]۔ ﴿وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ﴾ [الزخرف: 71:43] ''اور (جس سے) آنکھیں لذت پائیں۔'' اور یہاں لَذَّةٍ سے مراد ہے لَذِيْذَةٌ یا ذَاتَ لَذَّةٌ۔ (ل)

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّ لَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾

نہ اس میں ہلاکت ہوگی اور نہ وہ اس سے متوالے ہوں گے۔ (2784)

وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾

اور ان کے پاس نیچی نگاہوں والی بڑی آنکھوں والی ہوں گی۔

كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾

گویا کہ وہ محفوظ کیے ہوئے انڈے ہیں۔ (2785)

2784- ﴿غَوْلٌ﴾ کسی چیز کا ہلاک کر دینا ایسے طریق پر کہ محسوس نہ ہو۔ (غ)

﴿يُنْزَفُوْنَ﴾ [نَزِفَ الْمَاءَ] کے معنی ہیں کنویں سے تھوڑا تھوڑا کر کے سارا پانی کھینچ لیا اور اسی سے متوالے کو نَزِيْفٌ کہتے ہیں۔ گویا اس کا فہم بدمستی سے جاتا رہا یا اس عقل جاتی رہی اور اَنْزَفْتُ (جس سے يُنْزَفُوْنَ ہے) نَزَفْتُ سے زیادہ بلیغ ہے۔ (غ)

ان تین آیتوں میں **بہشتی نعمتوں میں سے پینے کی چیزوں** کا ذکر ہے۔ پہلے اسے مَعِيْنٍ کہا ہے۔ اور مَعِيْنٍ اسے کہتے ہیں جو ظاہر ہو یعنی سطح زمین پر جاری ہو۔ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ وہ ختم نہیں ہوتا اور سفید ہے۔ یعنی ہر قسم کے عیب سے پاک ہے [دیکھو نمبر: 494]۔ پھر اس میں پینے والوں کے لیے لذت ہے۔ یہ اس لیے کہا کہ اس دنیا میں جس چیز کو پی کر لوگ سرور حاصل کرتے ہیں وہ لذت سے خالی ہوتی ہے۔ پھر یہاں کی شراب آہستہ آہستہ انسانوں کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ مگر اس میں یہ بھی نقص نہیں۔ پھر اس سے عقل جاتی رہتی ہے۔ اس میں یہ بھی نقص نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں سرور ہے اور لذت ہے مگر وہ ہر قسم کے عیوب سے خالی ہے۔ اور یہ کیا چیز ہے؟ دوسری جگہ فرمایا: ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾ [محمد: 15:47] ''اس جنت کی (ایک) مثال ہے جس کا وعدہ متقیوں کو دیا جاتا ہے اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بگڑتا نہیں اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزا نہیں بدلتا۔ اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت ہے اور صاف کیے ہوئے شہد کی نہریں ہیں۔'' یعنی پانی کی نہریں ہوں گی اور دودھ کی، شراب کی اور شہد کی۔ اور یہی پینے کی معمولی اور اعلیٰ درجہ کی چیزیں ہیں۔ اور ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ﴾ کہہ بتا دیا کہ سچ مچ اس دنیا کا سا پانی اور اس دنیا کا سا دودھ اور اس دنیا کی سی شراب اور اس دنیا کا سا شہد نہیں بلکہ یہ مثال کے طور پر بتا دیا ہے۔ کیونکہ پانی پیاس بجھاتا ہے اور دودھ قوت دیتا ہے اور شراب سے سرور حاصل ہوتا ہے اور شہد میں شفا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ وہ چیزیں جن سے یہ اغراض یہاں حاصل ہوتی ہیں وہاں بھی ملیں گی گو ان کی کیفیت یہ نہیں۔

2785- ﴿قٰصِرٰتُ﴾ قَصْر یا قِصَر خلاف طول ہے اور قَصَرْتُ کے معنی ایک چیز کو چھوٹا کیا بھی آتے ہیں۔ اور یہ بھی اس کے بعض کو بعض سے ملایا اور اسی دوسرے معنی میں قَصْر بمعنی محل ہے جس کی جمع قصور ہے۔ ﴿وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا﴾ [الفرقان: 10:25] ''اور

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ سو وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے پوچھیں گے۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا۔

يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ (جو) کہا کرتا تھا کہ کیا تو ماننے والوں میں سے ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا ہمیں بدلہ دیا جائے گا۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ کہے گا، کیا تم جھانکنا چاہتے ہو؟

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ سو اس نے جھانکا تو اس کو دوزخ کے درمیان دیکھا۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ کہا اللہ کی قسم! قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دیتا۔

تجھے محل دے دے۔'' اور قَصَرْتُهٗ بمعنی [جَعَلْتُهٗ فِي الْقَصْرِ] بھی ہے یعنی اسے محل میں رکھا ﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾﴾ [الرحمن: 72:55] ''حوریں جو خیموں میں ٹھہرائی ہوئی ہیں۔'' اور [قَصَرْتُ الصَّلٰوةِ] کے معنی ہیں نماز کے بعض ارکان چھوڑ کر اسے چھوٹا کر دیا۔ اور عورت کو [قَاصِرَةُ الطَّرْفِ] کہتے ہیں جب وہ اپنی آنکھ اس چیز کی طرف نہ اٹھائے جس کی طرف آنکھ اٹھانا ناجائز ہے۔ اور [قَصَّرَ شَعَرَهٗ] اپنے بالوں کا کچھ حصہ کاٹ دیا۔ ﴿مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ﴾ [الفتح: 27:48] ''اپنے سر منڈواتے اور بال کٹواتے۔''

﴿الطَّرْفِ﴾ طَرْفٌ کسی چیز کی جانب ہے اور [طَرْفُ الْعَيْنِ] آنکھ کی پلک کو کہا جاتا ہے اور طرف کے معنی پلک کی حرکت ہیں اور پھر اس سے دیکھنا مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ پلک کی حرکت دیکھنے کو چاہتی ہے ﴿قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ [النمل: 40:27] ''تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے اسے تیرے پاس لے آتا ہوں۔'' اور [قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ] سے مراد عفت کی وجہ سے آنکھ کو بند کر لینے والیں۔ (غ)

﴿عِيْنٌ﴾ اَعْيَنُ اور عَيْنَاءُ کی جمع ہے۔ اور یہ لفظ آنکھ کی خوبصورتی کی وجہ سے بقر وحش پر بولے جاتے ہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ عورتوں کو تشبیہ دی گئی ہے۔ ﴿وَ حُوْرٌ عِيْنٌ﴾ [الواقعة: 22:56] ''اور خوبصورت حوریں۔'' (غ) بیل کو اَعْيَنُ اور گائے کو عَيْنَا کہا جاتا ہے اور بڑے آنکھ والے مرد کو بھی اَعْيَنُ کہا جاتا ہے جس کی جمع عِيْنٌ ہے۔ (ل)

وَ لَوۡ لَا نِعۡمَۃُ رَبِّیۡ لَکُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِیۡنَ ﴿۵۷﴾ اور اگر میرے رب کی نعمت نہ ہوتی تو میں بھی ان میں سے ہوتا جو (عذاب میں) حاضر کیے گئے ہیں۔

اَفَمَا نَحۡنُ بِمَیِّتِیۡنَ ﴿۵۸﴾ تو کیا (یہ سچ نہیں کہ) ہم مرنے والے نہیں۔

﴿بِیۡضٌ﴾ بَيْضَةَ واحد ہے جس کے معنی انڈا اس کی سفیدی کی وجہ سے ہیں۔ اور بَيْضَةٌ عورت کو بھی کنایۃً کہا جاتا ہے۔ ایک رنگ میں مشابہت کے لحاظ سے اور دوسرا اس کے محفوظ ہونے کے لحاظ سے۔ اور [بَيْضَةَ الْبَلَدِ] ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اہل شہر میں سے محفوظ اور ان میں رئیس ہوں۔ جیسا شاعر کے قول میں ہے [كَانَتْ قُرَيْشٌ بَيْضَةً] (غ) اور [بَيْضَةَ الدَّارِ] اس کے وسط اور بڑے حصہ کو کہا جاتا ہے اور بَیۡضَۃَ الۡاِسۡلَامِ اس کی جماعت اور ان کے اصل کو کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: [وَلَا تُسَلِّط عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ غَيْرِهِمْ فَيَسْتَبِيحَ بَيْضَتَهُمْ] (کنزالعمال فی سنن اقوال، جلد11، صفحہ121، حدیث: 30863) یعنی اے خدا! مسلمانوں پر ایسا دشمن ان کے غیر سے مسلط نہ کیجیو جو ان کی جماعت اور ان کے اصل کو ہلاک کر دے یعنی ان کا بکلی استیصال کر دے۔ (ل)

بہشت میں عورتیں بھی ہوں گی:

یہ تو ظاہر ہے، کیونکہ جو انعام مومن مردوں کے لیے ایمان اور عمل صالح پر ہے وہی مومن عورتوں کے لیے ہے اور مومن عورتیں اسی طرح بہشت میں جائیں گی جس طرح مومن مرد۔ اس لیے ﴿عِنۡدَہُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ﴾ میں ان پاک دامن بیبیوں کا ذکر بھی ہوسکتا ہے جنہوں نے یہاں اپنی نگاہوں کو کسی ناجائز موقعہ پر نہیں اٹھایا اور ان کا بَیۡضٌ ہونا بلحاظ ان کی سیادت وشرافت کے ہوسکتا ہے۔ اور ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بوڑھی عورت کے سوال پر کہا کہ جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہ ہوگی اور وہ غمناک ہوگئی تو آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰہُنَّ اِنۡشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلۡنٰہُنَّ اَبۡکَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتۡرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۳۸﴾﴾ [الواقعة: 56:35-38] ''ہم نے انہیں ایک نئی پیدائش میں اٹھا کھڑا کیا ہے۔ پس انہیں نوجوان بنایا ہے۔ محبت والیاں ہم عمر۔ برکت والوں کے لیے۔'' یعنی یہی بوڑھی عورتیں جنت میں ایک نئی پیدائش حاصل کرلیں گی، اس لیے ان پر بوڑھی کا لفظ صادق نہ آئے گا۔ لیکن چونکہ یہاں نعمائے بہشتی میں یہ ذکر ہے اور انہی کو دوسری جگہ ﴿حُوۡرٌ عِیۡنٌ﴾ بھی کہا ہے اس لیے یہ بہشت کی ان نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ [مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ] (صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ وَأَنَّهَا مَخْلُوقَةٌ، حدیث: 3244) جس طرح بہشت کے فَوَاکِہُ کو یہاں کے پھلوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور بہشت کے پانی اور دودھ کو یہاں کے پانی اور دودھ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح بہشت کی ﴿قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ﴾ کو بھی اس دنیا کی عورتوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں جس طرح بہشت کے فَوَاکِہُ اور بہشت کا پانی اور دودھ مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہیں۔ اسی طرح بہشت کی ﴿قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ﴾ بھی مردوں اور

اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾

مگر ہماری پہلی موت اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ (2786)

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾

یقیناً یہ بڑی کامیابی ہے۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

ایسی ہی چیزوں کے لیے چاہیے کہ عمل کرنے والے عمل کریں۔

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾

کیا یہ بہتر مہمانی ہے یا تھوہر کا درخت۔ (2787)

عورتوں کے لیے یکساں ہیں۔ قرآن نے بہشت کی کسی نعمت کے لحاظ سے مردوں اور عورتوں میں فرق نہیں کیا۔ پس بلا شبہ حور ایک بہشت کی نعمت ہے۔ مگر وہ نعمت مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہے۔ اور اصل بات جیسا کہ بارہا لکھا جا چکا ہے یہی ہے کہ جن نعمتوں کا ذکر آتا ہے وہ بطور مثال ہے۔ پس حُوْرٌ کا ذکر بھی بطور مثال ہے اور خوبصورتی میں اگر کسی چیز کی مثال دینی ہو تو وہ عورت سے ہی دی جا سکتی ہے۔ انسان جس طرح کھانے سے لذت حاصل کرتا ہے پینے سے لذت حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح حسن سے بھی لذت حاصل کرتا ہے اور یہ اس کے لیے سرور کا موجب ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ پس نعمائے بہشتی کا نقشہ نامکمل ہوتا اگر اس میں کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر ہوتا مگر ان چیزوں کا ذکر نہ ہوتا جو حسن سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیا انسان کی فطرت حسن و جمال سے لذت حاصل نہیں کرتی اور کیا انسان کے کمال سرور کا نقشہ اس میں حسن و جمال کی تصویروں کے بغیر مکمل ہو سکتا ہے؟ مگر ان باتوں کو شہوانی خیالات سے منسوب کرنا اپنے شہوانی خیالات کا نتیجہ ہے۔ کیفیات جنت کو ہم نہیں سمجھ سکتے، لیکن بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ نہ جنت میں بقائے نوع کی ضرورت ہے اور نہ ان امور کی جو بقائے نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ مزید بحث کے لیے دیکھو ﴿وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ﴾ [الدخان: 54:44] ''اور ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دیں گے۔'' اور یہاں عورت کی پاک دامنی کو اس کا سب سے بڑا جوہر قرار دیا ہے اور یہی اس کی حقیقی خوبصورتی ہے۔

2786- یہ اس جنتی کا قول ہے اور یہ اس کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا: ﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَ وَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝﴾ [الدخان: 56:44] یعنی اب ہم پر دوسری موت نہ آئے گی، کیونکہ جنت سے پھر نہ نکالے جائیں گے اور نہ کوئی تکلیف آئے گی۔

2787- ﴿زَقُّوْمٍ﴾ ﴿شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ﴾ سے مراد دوزخ کے ناپسندیدہ کھانے ہیں اور اسی سے زَقَمَ اور تَزَقَّمَ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو کوئی چیز نگل جائے۔ (غ) اور زَقُّوْمٍ طعام اہل نار ہے اور ابن سیدہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو قریش کو معلوم نہ تھا کہ زَقُّوْمٍ کیا چیز ہے۔ ابوجہل نے کہا کہ یہ درخت ہمارے ملک میں تو ہوتا نہیں۔ کیا کوئی جانتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ تو ایک شخص نے جو بلاد افریقہ سے واپس آیا تھا کہا کہ افریقی لغت میں زَقُّوْمٍ مکھن اور کھجور ملا یا ہوا ہوتا ہے۔ تو

اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾	ہم نے اسے ظالموں کے لیے سزا بنایا ہے۔
اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾	وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی جڑ میں اگتا ہے۔
طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾	اس کا خوشہ ایسا ہے جیسے شیطانوں کے سر۔
فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾	سو وہ اس سے کھائیں گے پھر اس کے ساتھ پیٹوں کو بھریں گے۔
ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾	پھر اس کے اوپر ان کے لیے کھولتے ہوئے پانی کی ملونی ہوگی۔(2788)
ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾	پھر ان کا لوٹ کر آنا دوزخ کی طرف ہے۔

ابوجہل نے اپنی لونڈی سے کہا کہ مکھن اور کھجوریں لے آؤ۔ تب وہ اسے کھاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہی ہے جس سے محمد (ﷺ) ہمیں ڈراتے ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی ﴿اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾﴾ اور شیاطین میں یہاں تین وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا خوشہ بدنمائی میں گویا شیطانوں کے سر کی طرح ہے اور وہ گو دیکھے نہ جاتے ہوں۔ لیکن قبیح چیز کے متعلق کہا جاتا ہے [كَاَنَّهٗ رَأْسُ شَيْطَانٍ]۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ شیطان ایک قسم کے سانپ کا نام ہے جس کا منہ بہت بدنما ہوتا ہے۔ تیسرا یہ کہ ایک بدشکل روئیدگی ہوتی ہے جس کا نام ﴿رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ﴾ ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مجھے خبر دی کہ زَقُّوْم ایک سیاہ سا درخت ہے جس کے چھوٹے چھوٹے پتے ہوتے ہیں اور اس کے پتوں کے سرے بہت بدنما ہوتے ہیں اور ثعلب سے ہے کہ زَقُّوْم ہر ایک کھانا ہے جو قتل کر دے۔ (ل)

معلوم ہوا کہ یہاں ﴿شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ﴾ سے مراد تھوہر کا درخت نہیں جو اس دنیا میں ہوتا ہے بلکہ یہ کوئی اور درخت ہے جو دوزخ کی جڑ بنیاد میں اگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوزخ کی جڑ میں اگنے والا درخت اعمال بد نتائج کا ہی درخت ہے۔ اور ﴿رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ﴾ کا لفظ اختیار کرنے میں بھی اس طرف اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیطان کے پیچھے لگنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور رُءُوْسُ رَأْسٌ کی جمع ہے جس کے معنی سر ہیں اور کبھی اس سے مراد رئیس بھی لے لیا جاتا ہے۔ (غ)

2788- ﴿لَشَوْبًا﴾ شَوْبٌ کے معنی خَلْطٌ یعنی ملاوٹ ہیں۔ (غ) ﴿اَلْفَوْا﴾ [اَلْفَيْتُ وَجَدْتُّ] میں نے اسے پایا۔ ﴿اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ﴾ [البقرة: 170:2] ''جس پر ہم نے پایا۔'' ﴿وَ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا﴾ [يوسف: 25:12] ''اور دونوں نے اس کے خاوند کو پایا۔'' (غ)

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾	انہوں نے اپنے باپ دادوں کو گمراہ پایا۔
فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾	اور وہ اسی (قدموں کے) نقشوں پر دوڑے چلے جاتے ہیں۔
وَ لَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾	اور ان سے پہلے بھی بہت سے پہلے لوگوں میں سے گمراہ ہوئے۔
وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾	اور ہم نے ان کے اندر ڈرانے والے بھیجے۔
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾	سو دیکھ کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ڈرائے گئے۔
ع 2 53 6 اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۷۴﴾	مگر خدا کے مخلص بندے (بچ گئے)۔
وَ لَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾	اور نوح نے ہمیں پکارا۔ سو ہم کیسے اچھے (دعا) قبول کرنے والے ہیں۔
وَ نَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾	اور ہم نے اسے اور اس کے پیروؤں کو بڑی سختی سے نجات دی۔
وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾	اور ہم نے اس کی نسل کو (ہاں) انہی کو باقی رکھا۔
وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾	اور ہم نے پچھلے لوگوں میں اس کا (ذکر خیر) باقی رکھا۔ (2789)
سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾	قوموں میں نوح پر سلام ہے۔

2789- ﴿تَرَكْنَا﴾ کا مفعول محذوف ہے یعنی ثنائے حسن اور یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور یوں بھی معنی کر لیے گئے ہیں کہ اگلا قول ﴿سَلٰمٌ﴾ والا باقی چھوڑا۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٠﴾	اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨١﴾	وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔
ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٨٢﴾	پھر دوسروں کو ہم نے غرق کر دیا۔
وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿٨٣﴾ وقف لازم	اور ابراہیم بھی اسی کے گروہ میں سے تھا۔ (2790)
اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٤﴾	جب وہ بے عیب دل کے ساتھ اپنے رب کے پاس آیا۔
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٨٥﴾	جب اس نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا، یہ کیا ہے جس کی تم پوجا کرتے ہو؟
اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿٨٦﴾	کیا تم اللہ کے سوائے جھوٹے بنائے ہوئے معبودوں کو چاہتے ہو؟
فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾	تو تمہارا خیال جہانوں کے رب کے متعلق کیا ہے؟
فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿٨٨﴾	تب اس نے ستاروں کو ایک نظر دیکھا۔
فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿٨٩﴾	اور کہا میں تو بیمار ہوں۔ (2791)

2790- تمام نبی ایک گروہ ہیں۔ کیونکہ اصل اصول سب کا ایک ہی ہے، توحید الٰہی کو دنیا میں پھیلانا۔ ﴿اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾﴾ [الأنبیآء: 92:21] ''یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے۔ اور میں تمہارا رب ہوں سو میری عبادت کرو۔''

2791- ﴿سَقِيْمٌ﴾ سُقَمٌ اور سُقْمٌ اس بیماری کو کہتے ہیں جو بدن سے مخصوص ہو۔ اور مَرَضٌ بدن میں بھی ہوتا ہے اور دل میں بھی ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ [البقرة: 10:2] ''ان کے دلوں میں بیماری ہے۔'' اور یہاں سَقِيْمٌ میں یا تو تعریض ہے اور یا گزشتہ کی طرف اشارہ ہے اور آئندہ کی طرف اور یا اس تھوڑے سے اختلال طبیعت کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے جسم میں بہرحال ہوتا ہے خواہ وہ اسے محسوس نہ کرے۔ اور [مَكَانٌ سَقِيْمٌ] کہا جاتا ہے جب اس مکان میں خوف ہو۔ (غ) اور لسان العرب

فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ پھر وہ پیٹھ پھیرتے ہوئے اس سے پھر گئے۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ سو وہ ان کے معبودوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کیا تم کھاتے نہیں۔ (2792)

میں ہے کہ سُقْمٌ مرض ہی ہے (تو اس لحاظ سے دل کی بیماری پر بھی یہ لفظ صادق آسکتا ہے)۔ چنانچہ ان اقوال میں سے جو ﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾ کی تفسیر میں دیئے گئے ہیں ایک یہی ہے کہ [سَقِیْمٌ بِمَا اَرٰی مِنْ عِبَادَتِکُمْ غَیْرَاللّٰہِ](ن) یعنی تمہاری غیراللہ کی عبادت کو دیکھ کر بیمار ہوگیا ہوں یعنی اس سے سخت بیزار ہوں۔ اور ایک قول ہے [سَقِیْمُ الْقَلْبِ لِکُفْرِکُمْ] (ر) تمہارے کفر کی وجہ سے میرا دل بیمار ہے۔ اور تاج العروس میں ہے کہ [قَلْبٌ سَقِیْمٌ۔ فَهْمٌ سَقِیْمٌ۔ کَلَامٌ سَقِیْمٌ] سب محاورات بولے جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ امام راغب کا سقم کو بدن سے مخصوص کرنا صحیح نہیں۔ اور کہا جاتا ہے [هُوَ سَقِیْمُ الصَّدْرُ عَلَیْهِ] جس کے معنی ہیں حَاقِدٌ یعنی اس کے خلاف کینہ رکھتا ہے۔ (ت)

حضرت ابراہیمؑ کی طرف جھوٹ منسوب کرنا غلط ہے:

اسے مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹوں میں سے ایک ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ ﴿صِدِّیْقًا نَّبِیًّا﴾ ان تینوں جھوٹوں کو خود جھوٹ ٹھہراتا ہے اور یہ کہنا کہ یہ جھوٹ اللہ کی راہ میں تھے بے معنی ہے۔ اللہ کی راہ اور بدی؟ یہ دونوں صورتیں جمع نہیں ہوسکتیں۔ بدی نہ اللہ کی طرف منسوب ہوسکتی ہے نہ اللہ کی راہ کی طرف۔ اگر جھوٹ بولنا برا فعل ہے تو کسی وقت میں بھی جائز نہیں، جس طرح چوری کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ مثلاً اگر ایک بت کو پہنائے ہوئے زیور چرانے جائز نہیں خواہ نیت ان کو اچھی جگہ صرف کرنے کی ہی ہو، تو جھوٹ بول کر بت کا توڑنا بھی جائز نہیں ہوسکتا۔ اور ظاہر ہے کہ ﴿سَقِیْمٌ﴾ سے مراد [سَقِیْمُ الْقَلْبِ] لے کر جس کی لغت اجازت دیتی ہے کوئی دقت باقی نہیں رہتی اور نہ خواہ مخواہ ایک نبی کی طرف جھوٹ منسوب کرنا پڑتا ہے۔ اور نجوم کی طرف دیکھ کر یہ فقرہ بمعنی [سَقِیْمُ الْقَلْبِ] اور بھی زیادہ موزوں ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ نجوم کی عبادت کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کی بحث کا ذکر ہے ﴿فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ﴾ [الأنعام: 77:6] ''پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا کہا، کیا یہ میرا رب ہے۔'' اور اگر بیمار ہی معنی لیے جائیں تو اس کے جھوٹ ہونے پر کیا دلیل ہے۔ ستاروں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات بہت چلی گئی ہے، تب انہوں نے کہا کہ میں بیمار بھی ہوں اور زیادہ نہیں جاگ سکتا۔ زبردستی اسے جھوٹ بنانے سے کیا حاصل ہے۔

2792- ﴿فَرَاغَ﴾ رَاغَ۔ رَوْغٌ مضبوط تدبیر کی طرف مائل ہونا ہے اور [رَاغَ فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ] کے معنی ہیں اس کی طرف مائل ہوا، کسی ایسے امر کے لیے جس کا اس سے باریک مضبوط تدبیر سے ارادہ کرتا ہے۔ ﴿فَرَاغَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ﴾ [الذاریات: 26:51] ''پس وہ اپنے گھر والوں کی طرف چپکے سے گیا۔'' یعنی مائل ہوا۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی قسم کے میلان کے ساتھ ایک چیز طلب

مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ تمہیں کیا ہوا تم بولتے نہیں؟

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾ پھر انہیں زور سے مارنے کی طرف متوجہ ہوا۔

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ تب وہ دوڑتے ہوئے اس کی طرف آئے۔ (2793)

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ اس نے کہا کیا تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے (خود) تراشتے ہو۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور جو تم بناتے ہو۔ (2794)

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾ انہوں نے کہا اس کے لیے ایک عمارت بناؤ پھر اسے شعلے مارتی ہوئی آگ میں ڈال دو۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾ سو انہوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی۔ پر ہم نے انہی کو نیچا دکھایا۔ (2795)

کی جائے اور [آیت نمبر: 93] میں ﴿فَرَاغَ عَلَيْهِمْ﴾ میں عَلٰی غلبہ کے اظہار کے لیے ہے۔ (غ)

2793- ﴿يَزِفُّوْنَ﴾ زَفِيْفٌ ہوا کا چلنا اور شتر مرغ کی تیزی ہے جس کے چلنے کے ساتھ پرواز ملا ہوا ہوتا ہے۔ پس ﴿يَزِفُّوْنَ﴾ بمعنی يُسْرِعُوْنَ ہے۔ یعنی تیزی سے دوڑتے ہوئے۔ (غ)

2794- ﴿مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ کے ظاہر معنی یہی ہیں کہ اس سے مراد بت وغیرہ ہیں جنہیں وہ تراش کر بناتے تھے۔ (ر) مطلب یہ ہے کہ تم پتھر، لکڑیوں وغیرہ سے بت بناتے ہو، حالانکہ ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور بعض نے ﴿مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ سے مراد اعمال انسانی بھی لیے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان اعمال کا خالق اس لیے ہے کہ اسی نے وہ اسباب پیدا کیے ہیں جن سے یہ اعمال بنتے ہیں۔ اور بعض نے مَا کو استفہامیہ انکار و تحقیر کے لیے لیا ہے [اَیَّ شَیْءٍ تَعْمَلُوْنَ] یہ تم کیا کام کرتے ہو؟ (ر)

2795- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ **حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو آگ میں ڈالنے کی تجویز** تھی وہ کَیْدٌ کے رنگ کی تھی۔ یعنی کوئی باریک خفیہ تدبیر تھی اور ان کا اَسْفَلْ یا ذلیل ہونا اس چال میں ناکامی ہے۔

وَ قَالَ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ ﴿۹۹﴾

اور اس نے کہا میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں۔ وہ مجھے رستہ دکھائے گا۔ (2796)

رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰۰﴾

میرے رب! مجھے (اولاد) عطا فرما (جو) نیکوکاروں میں سے (ہو)۔

فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیۡمٍ ﴿۱۰۱﴾

سو ہم نے اسے ایک بردبار لڑکے کی خوش خبری دی۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُكَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾

سو جب وہ اس کے ساتھ کام کاج (کی عمر) کو پہنچا اس نے کہا اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں، تو دیکھ تیری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا اے میرے باپ! جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے کر، تو مجھے اگر اللہ چاہے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔ (2797)

2796- رب کی طرف جانے سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہجرت کر کے اس مکان کی طرف چلا جاؤں جس کا رب نے حکم دیا ہے۔ اور اسے بعض نے شام اور بعض نے مصر کہا ہے۔ (ر) اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ تمہاری چالوں سے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور ﴿سَیَهۡدِیۡنِ﴾ میں ہدایت سے مراد کامیابی کا رستہ دکھانا ہے۔

2797- ﴿السَّعۡیَ﴾ [دیکھو نمبر: 1817] اور یہاں مراد اس سے مل کر اس کے شغلوں اور حاجتوں میں کوشش کرنا ہے۔ (ر) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی عمل مروی ہیں۔ (ج)

حضرت ابراہیمؑ کو بیٹا قربان کرنے کا حکم:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو ذبح کیا ہے تو ہوسکتا ہے کہ واقعی یہی دیکھا جو کچھ دیکھا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کر دیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رؤیا میں حکم دیا گیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دیں۔ (ر) اور الفاظ ﴿مَا تُؤۡمَرُ﴾ صاف بتاتے ہیں کہ یہی بات حق ہے اور اسی کے مطابق توریت میں ہے یعنی خدا نے ابراہیم کو حکم دیا تھا کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کریں [پیدائش: 1:22, 2] اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نذر مانی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں گے تو اس نذر کے پورا کرنے کا حکم ہوا۔ (ج) بہرحال الفاظ قرآنی اور توریت کے بیان دونوں سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹا قربان کرنے کا حکم ہوا تھا۔

ذبیح اسماعیلؑ تھے نہ اسحاقؑ:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون سا بیٹا تھا جس کے قربان کرنے کا حکم ہوا تھا؟ توریت میں صاف طور پر اسحاق کا نام دیا ہے اور مسلمانوں میں سے بھی بعض نے اسی بنا پر اسحاق کا نام لے دیا ہے۔ مگر قرآن کریم کی صراحت اس کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ یہاں صفائی سے پہلے ایک بیٹے کے لیے دعا کا اس پر بشارت کا، اسی بیٹے کے قربان کرنے کا ذکر ہے اور اس ذکر کے خاتمہ پر فرمایا: ﴿وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۱۱۲﴾ [112] جس سے معلوم ہوا کہ یہ سب حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر ہے۔ (ر) اسحاق کی بشارت بھی اس واقعہ کے بعد ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ کتاب پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال کی تھی جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان کی عمر ننانوے سال کی تھی جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت ملی۔ گویا اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر چودہ سال کی تھی۔ اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام ﴿بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ﴾ کا مصداق ہیں اور یہ عمر دس بارہ سال کی ہونی چاہیے۔ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو خطاب کیا [يَا اِبْنُ الذَّبِيْحَيْنِ] (المستدرك للحاكم، جلد2، صفحہ604، حدیث: 4036) اے دو ذبیحوں کے بیٹے۔ جس میں ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ کی طرف۔ کیونکہ عبدالمطلب نے جب زمزم کھودا تو نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس امر کو آسان کر دے تو وہ اپنا ایک بیٹا قربان کرے گا۔ پھر جب قرعہ نکالا گیا تو عبداللہ کے نام قرعہ نکلا اور آخر سو اونٹ فدیہ میں دیا گیا۔ اور حدیث جو بیان کی جاتی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسحاق علیہ السلام سے ذبح کی سختی کو دور کیا تو ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب منکر ہے۔ (ر) اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف کی طرف جو یہ قول منسوب ہے تو قرآن کریم کی صراحت کے مقابل قابل قبول نہیں۔ (ث) اور توریت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دشمنی کی وجہ سے یہودیوں نے تحریف کر کے اسماعیل کی جگہ اسحاق کا نام رکھ دیا۔ کیونکہ جہاں قربانی کا حکم ہے وہاں ایک طرف اسحاق کا نام ہے دوسری طرف اس کے ساتھ ہی ہے ''اپنے اکلوتے بیٹے کو'' [پیدائش: 2:22] اب اکلوتے کا لفظ حضرت اسحاق علیہ السلام پر کسی صورت میں صادق نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اس سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام موجود ہیں۔ بلکہ یہ لفظ اسحاق علیہ السلام کی پیدائش سے پیشتر صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام پر صادق آ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مینڈھے کے بطور فدیہ دیا جانے کا ذکر توریت میں بھی ہے لیکن اس قربانی کی یادگار حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں عرب میں رہی اور یہ یادگار آج تک امت محمدیہ میں چلتی ہے اور کوئی اس کی یادگار حضرت اسحاق علیہ السلام کے نام سے وابستہ نہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا خواب یا حکم بے معنی نہ تھا۔ اور اس سے مراد صرف اس قدر نہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا جائے بلکہ اس کے نیچے ایک اور مفہوم تھا اور وہ یوں پورا ہوا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکم الٰہی کے ماتحت اپنے سے جدا کر کے ایک ایسے بیابان میں رکھا ہے جو بظاہر ذبح کرنے کے برابر تھا۔ اور اس کو یوں چھوڑا جانے میں ایک پُرحکمت اشارہ تھا جس کو بعد میں نبیوں نے کھولا۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ''کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾ ج

سو جب دونوں نے حکم مانا اور اسے ماتھے کے بل لٹایا۔(2798)

وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ لا

اور ہم نے اسے پکارا کہ اے ابراہیم!

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾

تو نے خواب سچ کر دکھایا، اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾

بے شک یہ ایک کھلا امتحان تھا۔

وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾

اور ہم نے ایک بھاری قربانی اس کا فدیہ دیا۔(2799)

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ لا

اور ہم نے پچھلے لوگوں میں اس کا (ذکر خیر) باقی رکھا۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۱۰۹﴾

ابراہیم پر سلام ہو۔

ہے۔'' [متی: 42:31] پس حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کے حکم میں اس کے مکہ معظّمہ میں تنہا چھوڑ اجانے کی طرف اشارہ تھا اور یہ خود ایک پیشگوئی تھی کہ یہ وہی پتھر ہے جو عمارت نبوت کے کونے کا سرا بنے گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی فرمایا: [أَنَا هٰذِهِ اللَّبِنَةُ، وَأَنَا خَاتِمُ النَّبِيِّينَ] (صحيح البخاری، كتاب المناقب، باب خَاتِمِ النَّبِيِّينَ ﷺ: 3535)

2798- ﴿تَلَّهٗ﴾۔ تَلّ بلند جگہ کو کہتے ہیں یعنی ٹیلہ اور تَلَّ کے معنی ہیں اسے ٹیلے پر لٹایا۔ (غ)

﴿لِلْجَبِيْنِ﴾ جَبِيْنٌ۔ جُبْنٌ ضعف قلب ہے اور جَبِيْن پیشانی یا ماتھے کی دونوں طرفیں ہیں۔ (غ)

انسان کی قربانی کا منسوخ ہونا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو جانا قابل اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ اس سے پہلے انسان کی قربانی کا رواج تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو رؤیا دیکھا اس کا منشا یہی سمجھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی دی جائے اور اس واقعہ سے درحقیقت انسان کی قربانی کی رسم منسوخ ہوئی اور جانوروں کی قربانی اس کی جگہ قرار پائی۔

2799- اس کا فدیہ تو مینڈھا تھا اور ﴿عَظِيْمٍ﴾ اسے اس لحاظ سے کہا کہ اس کی یادگار میں ہمیشہ کے لیے دنیا میں ایک قربانی قرار پائی۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٠﴾ اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١١﴾ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾ اور ہم نے اسے اسحاق کی خوش خبری دی۔ایک نبی (کی) جو نیکو کاروں میں سے تھا۔

وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَ عَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿١١٣﴾ ع 3 39 7 اور ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت دی اور ان دونوں کی نسل سے نیکی کرنے والے بھی ہیں اور اپنے نفس پر کھلا ظلم کرنے والے (بھی)۔

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿١١٤﴾ اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا۔

وَ نَجَّيْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿١١٥﴾ اور ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی سختی سے نجات دی۔

وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٦﴾ اور ہم نے انہیں مدد دی، سو وہ غالب ہوئے۔

وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿١١٧﴾ اور ہم نے دونوں کو واضح کتاب دی۔ (2800)

وَ هَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١١٨﴾ اور ہم نے دونوں کو سیدھے رستے پر چلایا۔

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ اور ہم نے دونوں کا پچھلے لوگوں میں (ذکر خیر) باقی رکھا۔

سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿١٢٠﴾ موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو۔

2800- ﴿الْمُسْتَبِيْنَ﴾ بَانَ۔ اِسْتِبَانَ۔ تَبَيَّنَ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی واضح ہوا۔ ﴿وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ [الأنعام: 55:6] ''اور تا کہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔'' (غ)

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

وَ اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اور الیاس بھی رسولوں میں سے تھا۔

اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے کو چھوڑتے ہو۔ (2801)

اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ (یعنی) اللہ کو جو تمہارا رب اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا رب ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ پس وہ (عذاب میں) حاضر کیے گئے ہیں۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ مگر اللہ کے مخلص بندے (بچ گئے)۔

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اور ہم نے پچھلے لوگوں میں اس کا ذکر (خیر باقی) رکھا۔

کتاب یا توریت صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں دی گئی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کو۔ پس اصل کتاب دونوں کی وحی پر مشتمل ہے۔ چونکہ بعض قسم کے کام جیسے عبادت وغیرہ کا کرانا حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد تھے اس لیے اس کے متعلق حضرت ہارون علیہ السلام کو وحی ہوئی ہوگی اور ﴿الْمُسْتَبِيْنَ﴾ بلحاظ تفصیلات شریعت اسے کہا۔

2801- ﴿بَعْلًا﴾ بَعْل [دیکھو نمبر: 293] اور عرب کے لوگ اپنے معبود کو جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تقرب چاہتے بَعْل کہتے تھے۔ (غ) اور قوم الیاس کا بت بھی بَعْل تھا (ر) اور لغت یمن میں بَعْل ربّ کو کہتے ہیں۔ (ج) اور بَعْل سورج یا سورج دیوتا کا قائم مقام بھی ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾	الیاس پر سلام ہو۔ (2802)
اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾	اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾	وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔
وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾	اور لوط بھی رسولوں میں سے تھا۔
اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾	جب ہم نے اسے اور اس کے اہل کو سب کو نجات دی۔
اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾	سوائے ایک بڑھیا کے (جو) پیچھے رہنے والوں میں سے (تھی)۔
ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾	پھر دوسروں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔
وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾	اور تم ان پر صبح کے وقت گزرتے ہو۔
ع 4 25 8 وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾	اور رات کو، تو پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟
وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾	اور یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔

2802- ﴿اِلْ يَاسِيْنَ﴾ اِلْیَاس کی دوسری صورت ہے جیسے سِیْنَا اور سِیْنِیْنَ یا اِدْرِیْس اور اِدْرِیْسِیْن۔

حضرت الیاس علیہ السلام نویں صدی قبل مسیح کے نصف میں ظاہر ہوئے اور ان کا وعظ بعل کے خلاف تھا۔ دیکھو یہودی انسائیکلو پیڈیا۔

حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر صرف ایک اور موقعہ پر قرآن شریف میں آتا ہے یعنی [الأنعام: 86:6] میں۔

ذکر انبیاء میں ترتیب:

اس سورت میں انبیاء کا ذکر جس ترتیب سے کیا ہے اس میں بظاہر کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ پھر موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا، پھر الیاس علیہ السلام کا جو نویں صدی قبل مسیح کے ہیں، پھر لوط علیہ السلام کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہمعصر ہیں، پھر یونس علیہ السلام کا جو آٹھویں صدی قبل مسیح کے ہیں۔ اب اگر حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر درمیان میں نہ ہوتا تو یہ

اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگا۔ (2803)

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ سو اس نے قرعہ ڈالا، پھر وہ مغلوب ہوا۔ (2804)

ترتیب تاریخی تھی۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آپ کے خاندان کی شاخ اسرائیل کا ذکر ہے اور اسماعیلی شاخ میں چونکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایک نبی ہیں، اس لیے آخر پر آپ کا ذکر ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر یہاں اس مناسبت سے لایا گیا ہے جسے قرآن کریم نے صراحت سے بیان فرمایا: ﴿وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ بِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾﴾ [137-138] یعنی ان کی تباہ شدہ بستیاں شب و روز تمہاری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور باقی کا تو صرف انہوں نے ذکر ہی سنا ہوا تھا۔ اور یونس علیہ السلام سے پہلے لوط علیہ السلام کا ذکر لانے میں ایک اور مناسبت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے یہاں تک شوخی کی کہ جب عذاب کی خبر انہیں پہنچ گئی اس وقت بھی خود حضرت لوط علیہ السلام کے مہمانوں سے بدسلوکی کرنے کی کوشش کی اور گستاخی میں حد سے بڑھ گئے، اس لیے سب کے سب تباہ ہوئے۔ لیکن حضرت یونس علیہ السلام نے جب اہل نینوا کو عذاب کی خبر دی تو انہوں نے گریہ وزاری اختیار کی اور رجوع الی اللہ کیا، اس لیے سب بچ گئے۔

2803- ﴿اَبَقَ﴾ اِبَاقٌ غلاموں کا بھاگنا اور چلا جانا ہے۔ جب نہ انہیں کوئی خوف ہو اور نہ ان سے زیادہ مشقت لی جاتی ہو اور حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق یہی لفظ بولا گیا ہے جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے۔ (ل)

یوں تو ہجرت سنت انبیاء ہے مگر **حضرت یونسؑ کی ہجرت** پر لفظ اِبَاقٌ بولا گیا ہے۔ گویا ابھی وہ خوف کی حالت نہ تھی جس کے لیے ہجرت ضروری ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اس لفظ کی لغوی تشریح سے ظاہر ہے۔ جب خوف کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ اس کے لیے ہجرت ضروری ہو تو انبیاء کو اللہ تعالیٰ ارشاد فرما دیتا ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ [القلم: 48:68] ''سو اپنے رب کے حکم کا صبر سے انتظار کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جا۔'' یعنی مصائب کو برداشت کرو اور خوف کی حالت میں رہ کر بھی دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حکم دے کہ ہجرت کر جاؤ۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت نہیں کی جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں آیا۔ پس حضرت یونس علیہ السلام کی ہجرت قبل از وقت اور حکم الٰہی کے پہنچنے سے پیشتر ہونے کی وجہ سے اس پر اَبَقَ بولا گیا ہے۔

2804- ﴿فَسَاهَمَ﴾ سَهْمٌ تیر کو کہتے ہیں اور خط کو بھی اور سَاهَمَ دوسرے کے ساتھ قرعہ اندازی کی۔ اور سُهَامٌ اور سَهَامٌ دبلا پن اور رنگ کا متغیر ہونا ہے۔ (ل)

﴿الْمُدْحَضِيْنَ﴾ دَحَضَ اصل میں پھسلنا ہے۔ پھر دلیل کا باطل ہونا [دیکھو نمبر: 1934]۔ اور سورج کے ڈھلنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (غ) اور مُدْحَضٌ سے مراد مغلوب ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ بائبل میں کتاب یونا ہ میں مذکور ہے۔ اس میں اور قرآن کریم کے بیان میں یہ اختلاف ہے کہ بائبل

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ سو مچھلی نے اسے لقمہ بنایا اور وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے والا تھا۔(2805)

میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کو اہل نینوا کی طرف جانے کا حکم دیا تو وہ ترلیس کو بھاگ گئے اور اس وقت یہ کشتی میں سوار ہونے کا قصہ پیش آیا اور اس کے بعد آپ اہل نینوا کی طرف گئے۔ اور پھر جب اہل نینوا کی گریہ وزاری کی وجہ سے ان سے عذاب ٹل گیا تو یونس علیہ السلام ناراض ہو گئے۔ یہ دونوں باتیں یعنی نبی کا انکار کرنا اور خدا تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے دوسری طرف چلے جانا اور خدا سے ناراض ہونا شان نبوت کے منافی ہیں۔ اور قرآن کریم میں مذکور نہیں اور نہ یہ بات قابل قبول ہے۔ البتہ کشتی کا واقعہ اور قرعہ اندازی سے حضرت یونس علیہ السلام کا دریا میں ڈالا جانا بائبل میں بھی مذکور ہے اور قرآن شریف سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔

2805- ﴿فَالْتَقَمَهُ﴾ اَلْتَقَمَ۔ لَقَمَ جلدی سے کھایا اور لَقِمَ اور اَلْتَقَمَ منہ میں لینا ہے۔ [إِذَا اَخَذْتُهَا بَغْيِكَ] اور اِلْتَقَامَ مہلت سے نکل جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: [أَنَّ رَجُلًا أَلْقَمَ عَيْنَهُ خُصَاصَةَ الْبَابِ] (سنن نسائی، کتاب القسامة، باب ذِكْرِ حَدِيثِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ فِي الْعُقُولِ وَاخْتِلَافِ النَّاقِلِينَ لَهُ، حديث: 4875) جس کے معنی کیے گئے ہیں کہ دروازے میں جو شق تھا اسے اپنی آنکھ کے مقابل رکھا۔ گویا اسے آنکھ کے لیے ایسا بنایا جیسا منہ کے لیے لقمہ ہوتا ہے۔ (ل)

﴿الْحُوْتُ﴾ بڑی مچھلی کو کہتے ہیں اور مثال کے طور پر انسان پر اشعار عرب میں بولا گیا ہے [حُوْتًا إِذَا مَا زَادُنَا جِئْنَا بِهٖ] جس کی تشریح کی ہے کہ وہ حُوت بمعنی بڑی مچھلی کی طرح ہے کہ جو کچھ نگل جائے اسے کفایت نہیں کرتا۔ اور حُوت آسمان میں ایک برج ہے اور پرند کے پانی کے گرد گھومنے کو حُوت کہتے ہیں اور بَنُوْ حُوت ایک قبیلہ کا نام ہے۔ (ل)

﴿مُلِيْمٌ﴾ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 1826] مگر اَلَامَ میں ہمزہ تعدیہ کے لیے لے کر (جیسے اَقْدَمْتُهٗ میں) یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ملامت کرنے والے تھے۔ یعنی اپنے آپ کو۔ (ر)

کیا حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں رہے؟:

قرآن کریم میں حضرت یونس علیہ السلام کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے متعلق صریح لفظ نہیں۔ ہاں یہ الفاظ ہیں ﴿فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ﴾ جن کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مچھلی نے انہیں نگل لیا اور یہ بھی کہ مچھلی نے انہیں منہ میں لیا۔ یعنی مچھلی کے منہ میں چلے گئے۔ اور اس صورت میں ممکن ہے کہ یہی ان کے باہر نکال پھینکنے کا بھی موجب ہوا ہو۔ دوسرے لفظ جن سے آپ کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا استدلال کیا گیا ہے یہ ہیں ﴿لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾﴾ [144]۔ لیکن اول تو اس سے مراد مچھلی کا پیٹ میں لینا اس لیے درست نہیں کہ مچھلی ایسی کوئی نہیں ہو سکتی جو اس وقت سے لے کر قیامت تک زندہ رہے۔ جب سب چیزوں

فَلَوْ لَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لیکن اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا۔

پر فنا ہے اور اس زمانہ کے سب جاندار مر چکے ہیں تو مچھلی کا قیامت تک زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مچھلی مر کر حضرت یونس علیہ السلام اسی طرح صحیح سالم اس کے پیٹ میں رہتے تو مری ہوئی چیز کے اجزاء قائم نہیں رہ سکتے۔ دوسرے اگر مچھلی کا پیٹ بھی مراد لیا جائے تو یہاں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ مچھلی کے پیٹ میں جانے یا نہ جانے کا کوئی قطعی ثبوت ان الفاظ میں نہیں۔ تیسرے الفاظ قرآنی ﴿فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ﴾ [الأنبیآء: 87:21] ''پس اس نے مشکلات میں پکارا'' ہیں جس سے یہ سمجھا گیا ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں آپ نے یہ دعا کی۔ لیکن [دیکھو نمبر: 957] و[نمبر: 2180] ظُلُمٰتٍ سے مراد شدائد بھی لیے جاتے ہیں اور وہیں ﴿وَ كَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾﴾ بتاتا ہے کہ مراد مشکلات ہی ہیں۔ البتہ یونا ہ کی کتاب میں حضرت یونس علیہ السلام کے تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا ذکر ہے۔ اور حدیث مرفوع اس بارہ میں صرف ایک ہے اور وہ ایک ہی طریق سے، یعنی محمد بن اسحاق کے طریق سے مروی ہے۔ اور ابن جریر نے اسے لیا ہے اور بزاز نے اپنی مسند میں اسی طریق سے اسے بیان کر کے لکھا ہے کہ سوائے اس طریق کے اور کسی طرح پر اس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونے کا علم ہم کو نہیں۔ اور یہ حدیث جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یوں ہے یہ جب اللہ تعالیٰ نے یونس کو مچھلی کے پیٹ میں قید کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مچھلی کی طرف وحی کی کہ اسے پکڑ لے اور نہ اس کے گوشت کو نقصان پہنچا اور نہ اس کی ہڈی کو توڑ۔ پھر جب اسے لے کر سمندر کی تہہ میں پہنچ گئی تو یونس نے کچھ حرکت سنی اور اپنے دل میں کہا یہ کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی اور وہ مچھلی کے پیٹ میں تھا کہ یہ سمندر کے جانوروں کی تسبیح ہے۔ تب اس نے بھی تسبیح کی جب وہ مچھلی کے پیٹ میں تھا اور فرشتوں نے اس کی تسبیح سنی اور کہا اے ہمارے ربّ! ہم ایک کمزور سی آواز کو غیر معمولی زمین سے سنتے ہیں۔ کہا یہ میرا بندہ یونس ہے۔ اس نے میری نافرمانی کی اس لیے میں نے اسے دریا میں مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیا۔ انہوں نے کہا کیا یہ وہ صالح بندہ ہے جس کا عمل صالح ہر رات اور دن میں تیری طرف چڑھتا تھا۔ کہا ہاں۔ پس انہوں نے اس کی شفاعت کی تو اس نے مچھلی کو حکم دیا اور اس نے اسے ساحل پر پھینک دیا۔ (ث) اور اقوال سلف میں مختلف باتیں ہیں۔ مثلاً ایک قول ہے کہ مچھلی نے چاشت کے وقت آپ کو نگلا اور ظہر کے وقت پھینک دیا۔ اور ایک قول میں تین دن حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اور ایک قول سات دن اور ایک قول میں چالیس دن۔ اور ظاہر ہے کہ چونکہ یونس علیہ السلام اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے تھے اس لیے یہ دریائے دجلہ تھا اور وہیں کی مچھلی ہونی چاہیے۔ مگر ایک قول یہ ہے کہ یہ مصر میں دریائے نیل سے اللہ تعالیٰ کی وحی پر حاضر ہو گئی تھی۔ اور ایک قول ہے کہ بحر اخضر کی مچھلی تھی اور اسے حکم ہوا تھا کہ دریاؤں کو پھاڑتی ہوئی چلی جائے۔ حالانکہ بحر اخضر سے دریائے دجلہ تک کوئی دریا یا سمندر نہیں۔ اور کسی میں ہے کہ یونس علیہ السلام کودنے کے لیے کشتی کے کنارے پر کھڑے تھے جب مچھلی کو وحی ہوئی اور وہ اتنی جلدی پہنچی کہ حضرت یونس علیہ السلام جب کودے تو سیدھے مچھلی کے پیٹ میں پہنچے۔ اور ایک قول ہے کہ مچھلی کشتی کے ساتھ ساتھ چلی اور اس کا سر دریا سے اٹھا ہوا تھا اور وہ سانس لے رہی تھی اور یونس علیہ السلام تسبیح کر رہے تھے یہاں

النصف

لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۙ﴿۱۴۴﴾ تو اس کے پیٹ میں رہتا اس دن تک کہ (لوگ) اٹھائے جائیں۔ (2806)

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۚ﴿۱۴۵﴾ پھر ہم نے اسے کھلے میدان میں ڈالا اور وہ بیمار تھا۔

وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۚ﴿۱۴۶﴾ اور ہم نے اس پر ایک کدو کا درخت اگایا۔ (2807)

تک کہ خشکی پر پہنچ گئی۔ اس کے مقابل پر یہ امر واقع ہے کہ اتنی بڑی مچھلی کوئی نہیں دیکھی گئی جس کے گلے میں سے سالم انسان گزر جائے۔ البتہ اتنے بڑے منہ کی مچھلیاں سمندروں میں ملتی ہیں، جن کے منہ میں سالم انسان آ سکتا ہے۔ اور معجزہ کہنا اسے اس لیے درست نہیں کہ یہ کوئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دشمنوں پر اتمام حجت کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک نبی پر احسان وانعام کا ذکر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت تو اتنی بڑی ہے کہ اس سے بھی عجیب تر کاموں کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اکیلی حدیث وہ بھی قصہ کے رنگ کی، اور پھر ایسی حدیث جسے کسی اعلیٰ پایہ کے محدث نے قبول نہیں کیا اور چند اقوال جن میں خود بہت سا اختلاف ہے۔ ان کی شہادت اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کے لیے کافی نہیں۔ لیکن اگر کوئی قطعی شہادت اس بات کی ہو تو ہمیں اس کے ماننے سے انکار نہیں ہوسکتا کہ قرآن کریم کے الفاظ کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے۔

2806- ﴿بَطْنِهٖٓ﴾۔ بَطْنٍ کے معنی پیٹ ہیں اور قبیلہ کو بھی بَطْنٍ کہتے ہیں اور وادی کا بھی بَطْنٍ کہلاتا ہے۔ (غ)

اگر یونس علیہ السلام تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو اس کے پیٹ میں قیامت کے دن تک رہتے۔ مگر یوم بعث تک کسی مچھلی کا زندہ رہنا تمام مسلمات اسلامی کے خلاف ہے۔ اور اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ وہ مچھلی غیر فانی ہے اور خدا کی صفات میں شریک ہے۔ اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام قیامت تک اس کے پیٹ میں زندہ محبوس رہتے، یہ بھی خلاف مسلمات امر ہے۔ مراد صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نام کو دنیا میں پھیلانے والے نہ ہوتے تو مچھلی ان کو نگل جاتی یا دریا میں ہی ڈوب کر مر جاتے اور یہی ان کا قیامت کے دن تک وہاں رہنا ہے۔ کیونکہ وہیں دریا میں ہی وہ مدفون ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لیے بچایا کہ وہ تسبیح کرنے والے یا اللہ تعالیٰ کا نام دنیا میں پھیلانے والے تھے۔ اور ﴿بَطْنِهٖٓ﴾ میں ضمیر دریا کی طرف جانا کوئی مستبعد امر نہیں۔ اس لیے کہ دریا کا مفہوم کشتی میں موجود ہے۔ اور دریا اس وقت تک رہیں گے جب تک یہ صف لپیٹی جائے۔

2807- ﴿يَّقْطِيْنٍ﴾ [قِطْنَ بِالْمَكَانِ] کے معنی اقام ہیں یعنی وہاں رہا اور ﴿يَّقْطِيْنٍ﴾ ہر وہ درخت ہے جو اپنی ساق پر کھڑا نہیں ہوتا یعنی جس کی بیل ہو۔ اور مجاہد کا قول ہے کہ ہر چیز جو زمین میں پھیلتی جائے وہ ﴿يَّقْطِيْنٍ﴾ ہے۔ اور اسی سے کدو، ککڑی، خربوزہ وغیرہ ہیں۔ اور ابن جبیر کا قول ہے کہ ہر چیز جو اگے اور اسی سال میں خشک ہو جائے وہ ﴿يَّقْطِيْنٍ﴾ ہے۔ (ل)

وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ اور ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا بلکہ (اس سے) زیادہ ہی تھے۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾ سو وہ ایمان لائے تو ہم نے انہیں ایک وقت تک سامان دیا۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ پس ان سے پوچھ کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے۔

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ یا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ موجود تھے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ دیکھو وہ اپنی طرف سے جھوٹ (بنا کر) کہتے ہیں۔

وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ کہ اللہ کی اولاد ہے اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ کیا اس نے بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح دی؟(2808)

حضرت یونسؑ اور کدو کا درخت:

بائبل میں ارنڈی کا درخت اگانے کا ذکر ہے گو وہاں دریا سے باہر پھینکا جانے پر یہ ذکر نہیں بلکہ بعد میں اہل نینوا سے ناراض ہو کر شہر سے باہر چلا جانے اور وہاں مکان بنا لینے پر یہ ذکر ہے۔ مفسرین نے عموماً کدو مراد لیا۔ لغوی تشریح دونوں پر صادق آسکتی ہے۔ غرض اس کی کیا تھی؟ بائبل میں یہ ذکر ہے کہ ایک دن یہ درخت اگا اور دوسرے دن ایک کیڑے نے اسے کھانا شروع کر دیا اور وہ خشک ہو گیا جس پر یونس کو افسوس ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''تجھے اس رینڈی کے درخت پر رحم آیا جس کے لیے تو نے کچھ محنت نہ کی اور نہ تو نے اسے اگایا جو ایک ہی رات میں اگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا۔ اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوا پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دہنے بائیں ہاتھ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مواشی بھی بہت ہیں شفقت نہ کروں۔'' [یوناہ: 4:11-10] اور مفسرین میں سے وہب کا قول بھی اسی کے قریب قریب ہے اور یہ بات ویسے بھی قرین قیاس ہے۔ کیونکہ سمجھانا یہ مقصود ہے کہ گو اللہ تعالیٰ نیکوں کو بچاتا ہے مگر وہ ان کے دشمنوں کو تباہ کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ اس کی مخلوق ہیں اور ان پر بھی وہ شفقت کرتا ہے۔

2808- ﴿اصْطَفٰى﴾ ہمزہ مفتوح ہمزہ استفہام انکاری ہے۔ ءَاِصْطَفٰى ہمزہ وصل حذف ہو گیا۔ دوسری جگہ ہے: ﴿وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ

مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ تمہیں کیا ہوا کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ یا تمہارے پاس کوئی کھلی سند ہے؟

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ سو اپنی کتاب لاؤ اگر تم سچے ہو۔

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ اور اس کے اور جنوں کے درمیان ناطہ تجویز کرتے ہیں۔ اور جن خوب جانتے ہیں کہ وہ (عذاب میں) حاضر کیے جاتے ہیں۔ (2809)

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اللہ اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ ہاں اللہ کے مخلص بندے (بچ جاتے ہیں)۔

فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ سو تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا﴾ [الزخرف: 19:43] ''اور انہوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں دیویاں بنایا۔''

2809- مطلب یہ ہے کہ اصل میں تو یہ ملائکہ کو نہیں پوجتے بلکہ جنوں یعنی شیاطین کو پوجتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [السبأ: 40:34-41] ''اور جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں کو کہے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے۔ کہیں گے، تو پاک ہے تو ہمارا کارساز ہے نہ یہ بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر ان پر ایمان لانے والے تھے۔'' پس اسی لحاظ سے فرمایا کہ یہ بت پرست فرشتوں اور خدا میں نہیں بلکہ شیاطین اور خدا میں نسب ٹھہراتے ہیں، یہی حال نصاریٰ کا ہے۔ [دیکھو نمبر: 2699] اس کا یہ مطلب نہیں کہ ملائکہ اور خدا میں نسب ہو سکتا ہے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو ان کی غلطی ایسی کھلی ہے کہ ان کی فطرت بھی اس کو دھکے دیتی ہے، یعنی شیاطین اور خدا میں نسب قائم کرنا۔ مگر اس ناپاک عقیدہ کو ایک اچھا لباس پہنانے کی کوشش کرتے ہیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں اور خدا کے درمیان نسب قائم کر رہے ہیں۔

مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ تم اس کے خلاف (کسی کو) فتنہ میں نہیں ڈال سکتے۔

اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ سوائے اس کے جو (خود) دوزخ میں جانے والا ہے۔[2810]

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ اور ہم میں سے کوئی نہیں مگر اس کے لیے ایک معلوم مقام ہے۔

وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ اور ہم صفیں باندھنے والے ہیں۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ اور ہم تسبیح کرنے والے ہیں۔[2811]

2810- ﴿بِفٰتِنِيْنَ﴾ فِتَنٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 243] آگ یا دکھ میں ڈالنا اور اس کے معنی ابتلا و امتحان بھی ہیں یعنی آزمائش میں ڈالنا۔ اور فَاتِنٌ اس سے اسم فاعل ہے اور صَالَ، صَلّٰی یُصَلِّی سے اسم فاعل ہے، یعنی آگ میں داخل ہونے والا۔

﴿عَلَيْهِ﴾ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس کے خلاف یا اس کی راہ سے ہٹا کر۔ اس آیت اور اگلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ مشرکوں یا ان کے معبودوں یعنی شیاطین کا کسی پر کوئی تسلط نہیں کہ کسی کو زبردستی فتنہ یعنی امتحان یا دکھ میں ڈال سکیں۔ ہاں جو خود جہنم کا رستہ لیتا ہے وہی جہنم میں جاتا ہے۔ [لَا يَسْتَهِلُّ لَكُمْ اِلَّا اَنْ تَفْتَنُوْا مَنْ هُوَ ضَالٍ مِثْلُكُمْ] (ر) اور پیچھے آچکا ہے: ﴿وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ۝﴾ [30] یہ اسی کے مطابق ہے۔

2811- [آیت نمبر: 164 سے 166] تک حکایت کے طور پر قول ہے اور مفسرین نے عموماً اسے قول ملائکہ سے حکایت لیا ہے۔ لیکن دوسرا قول اس بارہ میں یہ ہے کہ یہ مومنوں کے قول سے حکایت ہے [قِيْلَ هُوَ مِنْ قَوْلِ الرَّسُوْلِ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اَیْ وَ مَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا لَه مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ عَلٰى قَدْرِ اَعْمَالِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ] ''کہا گیا ہے کہ یہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول ہے کہ قیامت کے دن مسلمانوں میں سے کوئی نہیں ہوگا جس کو اپنے اعمال کے مطابق اپنا مقام معلوم نہ ہو۔'' (ر) اور دوسرے قول کو اس لیے ترجیح ہے کہ جن دو گروہوں کا ذکر چلتا ہے وہ کافر اور مومن ہیں۔ جب کفار اور مشرکین کی حالت کو بیان کیا تو اس کے بالمقابل ضروری تھا کہ مومنوں کا بھی ذکر ہوتا۔ چنانچہ [آیت نمبر: 160] میں ہے ﴿اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝﴾ اور ابتدائے سورت میں ﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝﴾ میں بھی دکھایا جا چکا ہے کہ مومن ہی مراد ہیں اور یہاں بھی وہی لفظ ہیں۔ اور ﴿مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ کی تشریح دوسری جگہ آچکی ہے ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾	اور یہ کہا کرتے تھے۔
لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾	اگر ہمارے پاس کوئی پہلوں کی نصیحت ہوتی۔ (2812)
لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾	تو ہم ضرور اللہ کے مخلص بندے ہوتے۔
فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾	سو اس کا انکار کیا۔ پس جان لیں گے۔
وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾	اور ہمارا حکم ہمارے بندوں (یعنی) رسولوں کی نسبت پہلے سے ہو چکا ہے۔
اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾	کہ وہ ضرور نصرت دیئے جائیں گے۔
وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾	اور کہ ہمارا لشکر ضرور غالب رہے گا۔ (2813)

مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ [41 -42] اور یہ امر کہ ملائکہ کی بھی صفوف ہیں بالکل صحیح ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ لیکن یہاں ذکر مومنوں کا ہی معلوم ہوتا ہے اور ابن ابی حاتم نے ولید بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ مسلمان صفیں باندھ کر کھڑے نہ ہوتے تھے جب تک کہ یہ آیت نازل نہیں ہوئی ﴿وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾﴾ (ر) اس سے بھی اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

2812- ذکر سے مراد یہاں نصیحت کی کتاب ہے جو منجانب اللہ نازل ہوئی ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے: ﴿وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ﴾ [فاطر: 42:35] ''اور اللہ کی پکی قسمیں کھاتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آئے تو وہ قوموں میں سے ہر ایک سے بڑھ کر ہدایت والے ہوں گے۔''

2813- **رسولوں کی نصرت اور مومنوں کا غلبہ:** سورت کے خاتمہ پر ان پُرزور الفاظ میں تحدی کر کے سورت کے اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور یہ سورت جیسا کہ اس کے مضمون اور طرز عبارت سے ظاہر ہے پہلے زمانہ کی سورتوں میں سے ہے۔ جب کوئی صورت آنحضرت ﷺ کی کامیابی کی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی اور مخالفت اپنے پورے زور پر تھی۔ رسولوں کو یقیناً مدد ملے گی، خدا کا لشکر یعنی مومن ضرور غالب آئیں گے، کس قدر صاف پیشگوئی اسلام کے غلبہ کی ہے۔ اور جن حالات میں یہ بیان ہوئی اس وقت کسی کو ایسے غلبہ کا وہم بھی نہ ہوسکتا تھا۔ یہی بیکسی کے وقت کہی ہوئی باتیں آخر عرب کے دلوں کو کھا گئیں۔ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ جن حالات میں یہ کہا گیا کوئی انسان نہ کہہ سکتا تھا۔ آج اللہ تعالیٰ کی یہی آواز ﴿اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾﴾ فضائے آسمانی میں گونج رہی ہے، مگر کاش کوئی اللہ کا جُند بنے اور اللہ کی

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾	سوان سے ایک وقت تک منہ پھیر لے۔ (2814)
وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾	اورانہیں دیکھتا رہ، یہ دیکھ لیں گے۔ (2815)
اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾	تو کیا ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں۔
فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾	سوجب وہ ان کی انگنائی میں آاُترے گا تو ان لوگوں کی صبح بری ہوگی جو ڈرائے گئے۔ (2816)
وَ تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾	اوراُن سے ایک وقت تک منہ پھیر لے۔

راہ میں اسی طرح جان و مال کو بے دریغ قربان کرے جس طرح ایک لشکر کو کرنا پڑتا ہے۔تو وہ نظارہ بھی دیکھ لے جو اللہ تعالیٰ نے عرب کو دکھایا ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾ [النصر: 110:1-2] ''جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی۔اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیا۔''

2814- ﴿حِيْنٍ﴾ کسی چیز کے بلوغ اور اس کے حصول کا وقت ہے اور اس کی خصوصیت مضاف الیہ سے ہوتی ہے جیسے ﴿وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ﴾ [صٓ: 38:3] ''خلاصی کا وقت نہ رہا تھا۔'' اور اکیلا ہو تو کئی وجہ پر آتا ہے۔مثلاً اَجَل کے لیے جیسے ﴿مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾﴾ [یونس: 10:98] ''ایک وقت تک ان کو سامان دیا۔'' اور سال کے لیے جیسے ﴿تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ﴾ [ابراھیم: 14:25] ''وہ اپنا پھل ہر موسم میں دیتا ہے۔'' اور گھڑی کے لیے جیسے ﴿حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ [الروم: 30:17] ''جب تم پر شام ہو اور جب تم پر صبح ہو۔'' اور مطلق زمانہ کے لیے جیسے ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ [الدھر: 76:1] ''یقیناً انسان پر زمانے کا ایک وقت آ چکا ہے۔'' ﴿وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۧ﴾ [صٓ: 38:88] ''اور تم ضرور اس کی خبر کو ایک وقت کے بعد جان لو گے۔'' اور حَانَ کے معنی قریب ہوا۔(غ)

ایک وقت تک منہ پھیر لے۔یہ مطلب نہیں کہ وعظ و نصیحت چھوڑ دو، بلکہ یہ منشا ہے کہ ان کے غلبہ کی پروا نہ کرو اور ان کی ایذا دہی پر صبر کرو۔ ﴿حَتّٰى حِيْنٍ﴾ میں اسی مسلمانوں کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر صراحت سے ﴿اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾﴾ میں ہے۔اسی لیے مفسرین نے اسے یوم بدر یا یوم فتح مکہ پر لگایا ہے۔

2815- یعنی ان کے موجودہ برے حال اور برے اعمال کو دیکھتے ہو وہ بھی ان کے نتیجہ کو دیکھ لیں گے۔

2816- یعنی وہی عذاب موعود جس کے لیے جلدی کر رہے ہیں وہ ان کے گھروں میں آ کر رہے گا اور سَاحَة یا انگنائی کے لفظ میں یہ اشارہ بھی صاف ہے کہ خود مکہ میں ان کی آخری مغلوبیت ہوگی۔

وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور دیکھتا رہ، وہ بھی دیکھ لیں گے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ ج

تیرا ربّ (ہاں) عزت والا رب، اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔

وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ ج

اور رسولوں پر سلام ہے۔

وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾ ع 5 44 9

اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔ (2817)

2817- رسولوں کی سلامتی پر رب العالمین کی تعریف اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کی ربوبیت روحانی کرتے ہیں اور گو خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے غلبہ اور نصرت کی یہ پیشگوئیاں ہیں مگر جمع کا صیغہ اس لیے آیا ہے کہ یہی قانون سب رسولوں کے لیے تھا اور پہلے رسولوں کا جو ذکر کیا ہے تو وہ بھی درحقیقت اسی غرض کے لیے تھا۔

سورۃ ص

نام:

اس سورت کا نام صٓ ہے اور اس میں 5 رکوع اور 88 آیتیں ہیں۔ اور صٓ بجائے ﴿صَدَقَ اللّٰہُ﴾ کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچ ہے اور وہ وعدہ حق کی کامیابی کا ہے۔ اور اس میں اشارہ ان تکلیفوں اور مصیبتوں کی طرف ہے جو راستبازوں کو پہنچتی ہیں اور بتانا یہ مقصود ہے کہ کتنے بھی دکھ انہیں پہنچیں مگر وہ مایوس نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی سچائی پر یقین کامل ہوتا ہے۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں کفار کی ضد اور عداوت کا ذکر ہے اور ان کے اس عزم کا کہ وہ کبھی اپنے بتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کو نہیں مانیں گے۔

② دوسرے رکوع میں حضرت داؤد علیہ السلام اور آپ کے مخالفین کا ذکر ہے۔ گویا بتایا ہے کہ باوجود بادشاہ ہونے اور سب سامان حفاظت موجود ہونے کے بھی آپ کے مخالف آپ کی جان لینے کے درپے تھے۔

③ تیسرے رکوع میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر ہے۔ اور اس میں بتایا ہے کہ جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے حکومت کے ظاہری سامانوں کی ضرورت تھی اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوگی۔ مگر انبیاء علیہم السلام کا دلی تعلق ان ظاہری سامانوں سے نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہی چاہتے ہیں۔

④ چوتھے رکوع میں حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر کیا اور بتایا ہے کہ راستبازوں کو صبر کا اجر کس طرح ملتا ہے۔ اور پھر اسی مضمون کو عام کیا ہے۔

⑤ پانچویں رکوع میں بتایا ہے کہ شیطان اور شیطان صفت لوگ ہمیشہ سے راست بازوں کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں اور ابلیس کی آدم سے مخالفت کا ذکر کیا ہے۔

تعلق اور زمانۂ نزول:

پچھلی سورت میں توحید کے آخری غلبہ کا ذکر تھا۔ تو یہاں بتایا کہ بڑے بڑے مصائب کے بعد اور بڑا صدق دکھانے کے بعد یہ غلبہ ملے گا۔ اس کے نزول کا زمانہ وہی معلوم ہوتا ہے جو پچھلی سورت کے نزول کا ہے۔

اٰیَاتُھَا 88 (38) سُوْرَۃُ صٓ مَکِّیَّۃٌ (38) رُکُوْعَاتُھَا 5

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ | اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝۱ | اللہ صادق ہے، بزرگی دینے والا۔ قرآن گواہ ہے۔(2818)

بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ۝۲ | بلکہ جو کافر ہیں وہ جھوٹی شیخی اور مخالفت میں ہیں۔

کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ۝۳ | ان سے پہلے ہم نے کتنی نسلیں ہلاک کیں، تب انہوں نے پکارا اور خلاصی کا وقت نہ رہا تھا۔(2819)

2818- ﴿صٓ﴾ اس کی تفسیر ضحاک سے [صَدَقَ اللّٰہُ] مروی ہے۔(ج) اور بعض نے مراد [صَدُوْرِ الْکُفَّارِ عَنِ الْقُرْاٰنَ] لیا ہے یعنی کفار کا قرآن سے روکنا۔(ر) سیاق پہلے معنی کو چاہتا ہے۔

قرآن سے شرف انسانیت کا حاصل ہونا:

یہاں ﴿اَلْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝۱﴾ کی قسم کھائی ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کی اس حیثیت کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ اس سے ذِکْر یعنی شرف ملتا ہے [دیکھو نمبر: 191]۔ اور جواب قسم درحقیقت پہلے صٓ میں مذکور ہے [صَدَقَ اللّٰہُ] یعنی اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے۔ خود یہ بات گواہ ہے کہ قرآن سے شرف ملتا ہے اور وہ بات جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی اور جس کے سچ ہونے کا یہاں ذکر ہے وہی ہے جو پچھلی سورت کے آخر میں ہے یعنی ﴿اِنَّ جُنْدَنَا لَھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾۔ بعض وقت سورتوں کا تعلق ایسا شدید ہوتا ہے کہ گویا دونوں سورتیں ایک ہی مضمون پر چلتی ہیں۔ یہاں یہی صورت ہے اور یہ بات بطور گواہی اس لیے پیش کی کہ وہ چیز جس سے انسان کو شرف ملتا ہے ضرور ہے کہ وہ دنیا میں غالب ہو۔ اس لیے کہ اگر اس دنیا کو بنانے والی کوئی مدبر بالارادہ ہستی ہے تو ضرور ہے کہ وہ چیز جس سے انسان کو بزرگی ملتی ہے وہ ضائع اور برباد نہ ہو بلکہ آخر کار غالب آئے۔ گویا ان لوگوں کی حالت کی طرف توجہ دلائی ہے جنہوں نے قرآن کو قبول کیا اور اس پر عامل ہوئے کہ کس طرح ایک ذلیل حالت سے نکل کر انہوں نے شرف انسانی کا بلند سے بلند مقام حاصل کیا۔ تو ایسے لوگ تباہ اور مغلوب نہیں ہو سکتے بلکہ غالب ہو کر رہیں گے۔ اس لیے اس کے مقابل پر اگلی آیت میں فرمایا کہ کافروں کو حقیقی شرف انسانیت تو حاصل نہیں صرف کچھ مال و ریاست کی وجہ سے جھوٹی شیخی دکھا رہے ہیں اور حق کی مخالفت اختیار کر رہے ہیں۔

2819- ﴿لَاتَ﴾ لَاتَہٗ حَقَّہٗ۔ یَلِیْتُہٗ اور آلَاتَہٗ کے معنی ہیں نَقَصَہٗ اسے کم کر دیا۔ ﴿لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا﴾ [الحجرات:

وَ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴

اور وہ تعجب کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک ڈرانے والا ان کے پاس آیا اور کافر کہتے ہیں یہ جادوگر (اور) جھوٹا ہے۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝۵

کیا سب معبودوں کو ایک ہی معبود بنا دیا! یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے۔(2820)

وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝۶

اور ان میں سے بڑے بڑے لوگ کہنے لگے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ثابت قدم رہو۔ اس بات میں کچھ غرض رکھی گئی ہے۔(2821)

[14:49] ''تمہارے عملوں میں سے تمہیں کچھ کم کر کے نہیں دے گا'' اور لَیْتَ آرزو اور تمنی کے لیے آتا ہے۔ ﴿یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾ [النبأ: 78:40] ''کاش میں مٹی ہوتا'' ﴿یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ﴾ [الحاقة: 69:27] ''اے کاش! وہ (موت) کام تمام کرنے والی ہوتی۔'' اور لَاتَ یہاں لَیْسَ کے ساتھ مشبہ ہے اور عموماً حِیْنَ کے ساتھ آتا ہے۔ اور یہ اصل میں لَا ہے اور ت حِیْنَ کے لیے بڑھائی گئی ہے۔ (ل) یات تاکید کے معنی یا مبالغہ کے لیے بڑھائی گئی ہے۔ (ر) اور لات اور عزی دو بتوں کے نام ہیں۔ (غ)

﴿مَنَاصٍ﴾ [نَاصِ اِلٰی کَذَا] کے معنی ہیں اس کی پناہ لی۔ اور [نَاصَ عَنْهُ] اس سے الٹا پھر گیا اور ﴿مَنَاصٍ﴾ کے معنی ملجا یا پناہ ہیں۔ (غ)

2820- ﴿عُجَابٌ﴾ فعال بنائے مبالغہ ہے۔ مراد ہے بہت عجیب۔

آنحضرت ﷺ کا عزم اور کفار کی مایوسی:

ترمذی اور مسند احمد میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ جب ابوطالب بیمار ہوئے تو قریش کی ایک جماعت اس کے پاس آئی اور کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے اور ایسا ایسا کہتا ہے تم اسے روک دو۔ ابوطالب نے آپ کو بلا بھیجا اور جب آپ آئے تو کہا آپ کی قوم شکایت کرتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ آپ ان کے معبودوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تو ان کو ایک بات پر جمع کرنا چاہتا ہوں اگر وہ اسے مان لیں تو عرب ان کا مطیع ہو جائے اور عجم جزیہ ادا کرے۔ تو سب نے گھبرا کر کہا کہ ایک کیا ایسی دس باتیں کہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ کلمہ ہے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾۔ تب وہ سب اٹھ کر چلے گئے اور یہ لفظ ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ اور یہ اگلی آیتیں نازل ہوئیں۔

2821- ﴿انْطَلَقَ الْمَلَاُ﴾ کے معنی دو طرح ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چلے گئے، دوسرے یہ کہ وہ بول اٹھے۔ جیسے دوسری جگہ ہے ﴿وَلَا

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۞

ہم نے پچھلے دین میں یہ نہیں سنا، یہ صرف بناوٹ ہے۔ (2822)

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۞

کیا ہم میں سے اسی پر نصیحت اتاری گئی، بلکہ وہ میرے ذکر کے بارے میں شک میں ہیں۔ بلکہ انہوں نے میرا عذاب نہیں چکھا۔ (2823)

يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ﴾ [الشعرآء: 13:26] ''اور میری زبان نہیں چلتی۔'' اور چونکہ یہاں سرداروں کا ذکر ہے ہے اس لیے دوسرے معنی ہی زیادہ موزوں ہیں اور یہ معنی گو مجازی ہوں مگر ایسے مشہور ہیں کہ حقیقی معنی کی طرح ہی ہیں۔ ﴿اصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ﴾ اس لیے کہا کہ انہیں خوف ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی باتوں سے لوگوں کے قدموں میں بت پرستی کے معاملہ میں لغزش نہ آجائے۔ ﴿اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ﴾ سے مراد ہے کہ توحید کا قائم کرنا اور بت پرستی کا دور کرنا ایک ایسا امر ہے جس کا ارادہ آنحضرت ﷺ نے کرلیا ہے۔ یعنی یہ ارادہ کرلیا ہے کہ ایسا کر کے رہیں گے اور یہ اب اس پر پورا زور لگائیں گے۔ یا یہ کہ مصائب زمانہ میں سے ایک مصیبت ہے جس کا ہمارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے۔ یا یہ کہ عرب وعجم کی سرداری ایک ایسی چیز ہے جس کا ارادہ ہر ایک کرتا ہے مگر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور تقال کی توجیہ یہ ہے کہ آپ کی غرض صرف ہم پر سرداری حاصل کرنا ہے۔

2822- **توحید کا سب مذاہب سے گم ہوجانا:** ﴿الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ﴾ سے مراد عیسائی مذہب بھی ہوسکتا ہے جیسے مقاتل کا قول ہے۔ کیونکہ اس میں بھی توحید نہیں بلکہ تثلیث کی تعلیم ہے۔ اور عرب کا مذہب بھی ہوسکتا ہے جیسے قتادہ کا قول ہے، اور درحقیقت کسی مذہب میں بھی توحید خالص کی تعلیم باقی نہ رہی تھی۔ اور بعض لوگوں نے یوں بھی اس کے معنی کیے ہیں کہ جو پیچھے آنے والا مذہب یا نبی آخرالزمان کا مذہب ہے اس کے متعلق ہم نے یہ نہیں سنا کہ پیشگوئیوں میں کہیں یہ بھی ذکر ہو کہ وہ سب معبودوں کا صفایا کردے گا۔ اور میرے نزدیک اس بات کو ترجیح ہے کہ اس سے مراد عیسائی مذہب ہے۔ اس لیے کہ اسلام سے پہلے یہی سب سے آخری مذہب تھا اور عیسائی لوگ بھی تین خداؤں کے قائل تھے۔ اور جس طرح عرب کے بت پرست خدا کی بیٹیوں کے قائل تھے یہ خدا کے بیٹے کے قائل تھے۔

2823- یعنی ان کا اعتراض یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر وحی کیوں نازل ہوئی۔ ﴿لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۞﴾ [الزخرف: 31:43] ''کیوں یہ قرآن دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر نہ اتارا گیا۔'' اس کا جواب دیا ہے کہ اصل میں اعتراض رسول اللہ ﷺ کی ذات پر نہیں، اس لیے کہ آپ کو تو امین اور صادق جانتے تھے۔ بلکہ وحی الٰہی کے متعلق شک ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے ﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۞﴾ [الأنعام: 33:6] ''پر وہ تجھے نہیں جھٹلاتے لیکن ظالم اللہ کی باتوں کا انکار کرتے ہیں۔'' دوسرا جواب دیا ہے کہ اس میں بھی حقیقت میں کوئی شک نہیں مگر جب

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝۹

کیاان کے پاس تیرے رب کی رحمت کے خزانے ہیں، (جو)غالب بہت دینے والا (ہے)۔

اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝۱۰

یاان کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور (اس کی) جوان کے درمیان ہے تو چاہیے کہ وہ ذریعے بنا کراوپر چڑھ جائیں۔(2824)

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱

یہ بھی ایک شکست خوردہ لشکر (اگلے) لشکروں سے ہے۔(2825)

تک عذاب نازل نہ ہو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

2824- ان دونوں آیتوں میں بتایا ہے کہ غالب آنے کے اسباب ان کے قبضہ میں نہیں ہیں۔اِرْتِقَاءٌ کے معنی اوپر چڑھنا ہیں[دیکھو نمبر: 1878]۔لیکن اس کا استعمال معانی میں بھی ہے جیسے ترقی فی العلم اور حدیث میں اہل جنت کے ایک گروہ کی صفت میں آتا ہے [الَّذِينَ لَا يَسْتَرْقُونَ] یعنی وہ جو اسباب دنیا کی طرف التفات نہیں کرتے۔(ل) پس یہاں اِرْتِقَاءٌ سے مراد اسباب یا ذرائع میں ترقی کرنا یا آگے بڑھنا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جتنا زور چاہے لگالیں وہ حق کو مغلوب نہیں کر سکتے۔

2825- ﴿مَهْزُوْمٌ﴾ هَزْمٌ کی اصل یہ ہے کہ کسی چیز کو دبایا جائے یہاں تک کہ وہ ٹوٹ جائے اور اسی سے هَزِيْمَةٌ بمعنی شکست ہے۔ ﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾[البقرة: 2:251] ''پس اللہ کے حکم سے انہوں نے ان کو بھگا دیا۔''

عظیم الشان لشکروں کی شکست کی پیشگوئی:

جب اوپر ان کی تکذیب پر زور لگانے کا ذکر کیا اور ان کو بتایا کہ جتنا زور تکذیب پر چاہے لگالیں غالب نہیں آسکتے بلکہ حق ہی غالب آئے گا۔تو اب صفائی سے یہ بتایا کہ یہ تکذیب کے لیے ایک لشکر تیار کریں گے۔﴿جُنْدٌ﴾ کے بعد مَا تنکیر کے لیے بڑھا کر اس کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے۔یعنی مَا یہاں تعظیم اور تکثیر کے لیے ہے۔اور ﴿هُنَالِكَ﴾ میں اشارہ آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی طرف ہے اور ﴿مَهْزُوْمٌ﴾ صیغہ اسم مفعول اس لیے لایا گیا ہے کہ تا تحقق وقوع کی طرف اشارہ کرے یعنی باوجود رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں ایک عظیم الشان لشکر جمع کرنے کے یہ شکست کھائیں گے۔اور ﴿مِّنَ الْاَحْزَابِ﴾ میں اشارہ پہلی قوموں کی طرف ہے، جیسا کہ اگلی دو آیتوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔یعنی جس طرح پہلے گروہوں اور جتھوں نے جو رسولوں کی تکذیب اور مخالفت کے لیے جمع ہوئے، شکستیں کھائیں اور مغلوب ہوئے، ایسا ہی نبی کریم ﷺ کی مخالفت میں جو عظیم الشان لشکر جمع ہوگا وہ شکست کھائے گا۔اور اس پیشگوئی میں بعض نے بدر کی طرف اور بعض نے فتح مکہ کی طرف

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿۱۲﴾

ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور لشکروں والے فرعون نے جھٹلایا۔(2826)

وَ ثَمُوْدُ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَّ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ﴿۱۳﴾

اور ثمود اور لوط کی قوم اور بَن کے رہنے والوں نے۔ یہ (شکست خوردہ) گروہ ہیں۔

اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾ ع 1 14 10

سب کے سب نے ہی رسولوں کو جھٹلایا۔ سو میرا عذاب ثابت ہوا۔

وَ مَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾

اور یہ کسی چیز کے منتظر نہیں مگر ایک آواز کے جس سے کوئی افاقہ نہیں۔(2827)

اشارہ مانا ہے۔ مگر یہ ان کی ساری جنگوں پر بحیثیت مجموعی صادق آتا ہے۔ اور بالخصوص اگر ﴿جُنْدٌ مَّا﴾ کا لفظ صادق آتا ہے تو وہ غزوۂ احزاب پر صادق آتا ہے۔ اور شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اس کا نام غزوۂ احزاب اور ان لشکروں کا نام احزاب رکھا گیا۔ ان ابتدائی سورتوں میں ایسی کھلی اور واضح پیشگوئیاں کہ مسلمان اور کفار میں جنگ ہوگی اور کفار کے عظیم الشان لشکر ہوں گے مگر بایں وہ شکست کھائیں گے، رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر آفتاب نصف النہار کی طرح روشن دلیلیں ہیں۔

2826- ﴿الْاَوْتَادِ﴾ وَتِد یا وَتِد کی جمع ہے جس کے معنی میخ ہیں ﴿وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ [النبأ: 7:78] ''اور پہاڑوں کو میخیں۔'' اور [اَوْتَادِ الْاَرْضُ] پہاڑوں کو کہا جاتا ہے اور [اَوْتَادِ الْبِلَادِ] بڑے بڑے سرداروں کو۔ اور ابن جریر نے یہ معنی بھی قبول کیے ہیں کہ ﴿الْاَوْتَادِ﴾ سے مراد بُنْيَانٌ یعنی عمارت ہے۔ کیونکہ خیمہ میخوں سے لگایا جاتا ہے۔ اور بیضاوی نے ﴿ذُو الْاَوْتَادِ﴾ کے معنی [ذُوالْجُمُوْعُ الْكَثِيْرَةُ] کیے ہیں۔ یعنی بہت جماعتوں یا لشکر والا۔ اور کشاف نے [ذُوْالْمَلِكِ الثَّابِتُ] معنی کیے ہیں، کیونکہ میخوں سے ایک چیز مضبوط ہوتی ہے۔ اور [ذُوالْجُنُوْدُ] یا لشکروں والا ہی زیادہ موزوں معنی ہیں۔ اس لیے کہ لشکروں کا لازمہ خیمے اور میخیں ہیں۔

یہاں بھی جو ترتیب مکذبین انبیاء کی دی ہے وہ تاریخی نہیں بلکہ مکانی ترتیب ہے۔ یعنی اول وہ ممالک جو حجاز سے دور پڑے ہوئے ہیں یعنی موصل اور احقاف اور مصر۔ اور پھر وہ مقامات لیے ہیں جو بالکل قریب ہیں اور جن پر اہل حجاز کا گزر اپنے سفروں میں بہت رہتا تھا یعنی علاوہ حجر وسدوم ومدین۔ اور اصحاب الایکہ یا بَن والوں کو پیچھے اس لیے رکھا کہ پہلے دونوں مقامات پر نشانات ہلاکت موجود تھے۔

2827- ﴿فَوَاقٍ﴾ مادہ فَوْقٌ ہے اور اِفَاقَةٌ یہ ہے کہ متوالا پن کے بعد فہم انسان کی طرف رجوع کرے یا بیماری کے بعد قوت رجوع

وَ قَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾

اور کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی ہمیں جلد دے دے۔ (2828)

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾

اس پر صبر کر جو یہ کہتے ہیں اور ہمارے قوت والے بندے داؤد کو یاد کر وہ (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا۔ (2829)

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾

ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ کام میں لگایا تھا۔ وہ شام اور دن چڑھتے تسبیح کرتے تھے۔

کرے۔ اور دودھ دوہنے میں اِفَاقَةٌ دودھ کا لوٹ کر آنا ہے اور فُوَاقٌ یا فَوَاقٌ وہ وقفہ ہے جو دو دفعہ دودھ دوہنے کے درمیان ہو اور یہاں ﴿فَوَاقٍ﴾ کے معنی راحت ہیں جو اس کی طرف لوٹ کر آئے۔ اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں کہ اس کے لیے دنیا کی طرف لوٹ کر آنا نہیں۔ (غ) اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: [عِيَادَةُ الْمَرِيضِ قَدْرِ فُوَاقَ نَاقَةٍ] بیمار کی بیمار پرسی اونٹنی کے دو دفعہ دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے برابر ہے۔ اور عرب میں محاورہ ہے [مَا اَقَامَ عِنْدِیْ فُوَاقَ نَاقَةٍ] جس سے مراد بہت تھوڑی دیر ٹھہرنا ہے اور بعض کے نزدیک فَوَاقٍ اور اِفَاقَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور اِفَاقَةٌ غشی یا متوالے پن سے ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ فواق فتح کے ساتھ بمعنی افاقہ یا راحت ہے جیسے مریض کا افاقہ اور فُوَاقٌ پیش کے ساتھ وقفہ ہے اور مراد اس سے انتظار ہے۔ (ل)

2828- ﴿قِطَّنَا﴾ قِطّ اصل میں وہ شے ہے جو عرض میں کاٹی جائے جیسا قِدّ وہ ہے جو طول میں کاٹی جائے اور قِطّ حصہ کو کہتے ہیں جو کسی کے لیے الگ کر دیا جائے گویا کہ وہ قطع کر دیا گیا ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی معنی کیے ہیں۔ اور قِطّ صحیفہ کو کہتے ہیں اور تحریر اور اس کاغذ پر جس میں تحریر ہو، دونوں پر بولا جاتا ہے۔ (غ) یعنی عذاب کو جلدی مانگتے ہیں۔

2829- ﴿ذَا الْاَيْدِ﴾ اَیْد اور اِد دونوں کے معنی قوت ہیں اور ﴿ذَا الْاَيْدِ﴾ کے معنی ذَا الْقُوَّةُ ہیں یعنی قوت والا۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کی قوت عبادت پر اتم تھی اور دوسری جگہ ہے ﴿وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ﴾ [الذاریات: 47:51] ''اور آسمان کو ہم نے قوت کے ساتھ بنایا'' اور اسی سے اَیَّدَ ہے۔ (ن) ﴿اَيَّدَهٗ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ [البقرة: 87:2] ''روح القدس کے ساتھ اس کی تائید کی'' یعنی تائید کی یا قوت دی۔ ﴿ذَا الْاَيْدِ﴾ سے مراد صاحب قوت ہی ہے اور ﴿اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ﴾ [45] میں اشارہ قوت کی طرف ہے جو ان کے لیے وجود میں لائی گئی۔ (غ)

وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾

اور پرندوں کو جو اکٹھے کیے گئے تھے سب اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ (2830)

وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

اور ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا اور اسے حکمت عطا کی اور بات کا فیصلہ کرنا (سکھایا)۔ (2831)

وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ۙ

وقف لازم

اور کیا تجھے دشمن کی خبر پہنچی ہے۔ جب وہ دیوار پھاند کر حجرے میں داخل ہوئے۔ (2832)

2830- ﴿اَوَّابٍ﴾ اَوْب کے لیے [دیکھو نمبر: 385] اور اَوَّابٌ۔ تَوَّابٌ کی طرح ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف ترک معاصی سے اور اچھے کام کرنے سے رجوع کرتا ہے اور یہ صرف اس جاندار سے مخصوص ہے جو ارادہ رکھتا ہے۔ (غ) یعنی سوائے انسان کے دوسرے جانداروں پر نہیں بولا جا سکتا۔

چونکہ اَوَّابٌ صرف انسانوں کو کہا جا سکتا ہے جو اختیار اور ارادہ رکھتے ہیں اور ترک معاصی اور فعل خیرات انہی کا کام ہو سکتا ہے اور یہی اَوَّابٌ کے معنی ہیں۔ اس لیے جِبَالَ اور طَيْرَ سے مراد بھی انسان ہونے چاہئیں۔ اور یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ پہاڑ اور پرندے اَوَّابٌ تھے۔ پس ﴿كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ﴾ بتاتا ہے کہ جِبَالَ اور طَيْرَ سے مراد یہاں انسان ہی ہیں۔ جِبَالَ سے انسان مراد ہونے پر [دیکھو نمبر: 1623]۔ اور طَيْرَ سے بھی مجازاً مراد انسان ہو سکتے ہیں۔ [دیکھو نمبر: 432] اور ممکن ہے کہ ایک طرف لفظ جِبَالَ میں بڑے بڑے طاقتور انسانوں کی طرف اشارہ ہو اور دوسری طرف طَيْرَ میں اعلیٰ درجہ کے روحانی انسانوں کی طرف۔ اور اصل میں تو مقصود ذکر آنحضرت ﷺ ہے اور داؤد علیہ السلام کے ذکر میں بتایا ہے کہ دونوں قسم کے انسان آپ کو دیئے جائیں گے۔ دوسری توجیہ کے لیے دیکھو [نمبر: 2173]۔

2831- ﴿فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ فَصْل ایک چیز کا دوسری سے الگ کرنا ہے اور اقوال و افعال میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور خَطَابٌ اور مُخَاطَبَةٌ کے معنی ایک دوسرے کی طرف کلام کا لوٹانا ہے۔ ﴿فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ وہ ہے جو مراجعت کلام کے معاملہ کا فیصلہ کر دے۔ (غ) یعنی جس بات میں جھگڑا ہو اس کا فیصلہ کرنا اور بعض مفسرین کا قول ہے کہ ﴿فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ یہ ہے کہ دلیل کے ساتھ فیصلہ کرے اور بعض کا قول ہے کہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنا مراد ہے۔ اور بعض کے نزدیک فیصلے میں فقاہت کا نام ہے۔ (ل)

2832- ﴿الْخَصْمِ﴾ خُصُوْمَةٌ جھگڑا کرنا ہے اور خِصْمٌ جھگڑا کرنے والا۔ اور یہ واحد جمع، مذکر مؤنث پر یکساں بولا جاتا ہے اور اس کی تثنیہ بھی آئی ہے ﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ﴾ [الحج: 19:22] ''یہ دو جھگڑنے والے ہیں جنہوں نے اپنے رب کے

اِذْ دَخَلُوْا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا
تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ
فَاحْكُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَاۤ
اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾

جب وہ داوٗد کے پاس آئے تو وہ ان سے گھبرا گیا۔انہوں نے کہا ڈر نہیں (ہم) دو فریق ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔سو ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور ناانصافی نہ کرنا اور ہمیں سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کر۔ (2832)ل

اِنَّ هٰذَاۤ اَخِیْ ۟ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً
وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۟ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا وَ
عَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾

یہ میرا بھائی ہے۔اس کی ننانوے دنبیاں ہیں اور میری ایک ہی دنبی ہے۔تو اس نے کہا اسے میرے سپرد کر دے اور جھگڑے میں مجھ پر غالب آ گیا۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰی
نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ
بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ
ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ

(داوٗدؑ نے) کہا یقیناً اس نے تجھ پر ظلم کیا ہے کہ تیری دنبی کو اپنی دنبیوں (میں ملانے) کے لیے مانگا اور بہت سے شریک ایک دوسرے پر زیادتی ہی کرتے رہتے ہیں۔سوائے ان کے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور وہ بہت ہی تھوڑے ہیں۔اور داوٗد نے سمجھا کہ ہم نے اسے مصائب میں ڈالا ہے۔سو اس نے اپنے رب

بارے میں جھگڑا کیا۔'' جہاں دو فریق یعنی مومن اور کافر مراد ہیں۔اور خَصِیْمٌ وہ ہے جو بہت جھگڑا کرے ﴿فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ﴾ [النحل: 4:16] ''پھر دیکھو وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہے۔'' اور خَصِمٌ وہ ہے جو خصومت سے مختص ہو ﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ﴾ [الزخرف: 58:43] ''بلکہ یہ جھگڑالو ہی ہیں۔'' (غ) اور یہاں خَصْمٍ سے مراد حضرت داوٗد علیہ السلام کے ساتھ جھگڑا کرنے والے معلوم ہوتے ہیں۔

﴿تَسَوَّرُوا﴾ سُوْر (دیوار) سے ہے۔اس نے دیوار پھاندی۔(ل)

2832ل- ﴿الصِّرَاطِ﴾ طریق مستقیم یعنی سیدھے رستے کو کہا جاتا ہے اور اسے سِرَاطٌ بھی کہا جاتا ہے یعنی آسان۔(غ)

السجدۃ 10 رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۩ ﴿٢٤﴾ کی حفاظت مانگی اور رکوع کرتا ہوا گر گیا اور (اللہ کی طرف) متوجہ ہوا۔(2833)

2833- **حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریاہ کی جورو کا باطل قصہ:** یہاں مفسرین نے اوریاہ کی جورو کا قصہ لکھا ہے جو اصل میں بائبل سے لیا گیا ہے اور ابن جریر نے اسے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں [قَدْ ذُكِرَ الْمُفَسِّرُوْنَ هَاهُنَا قِصَّةَ أَكْثَرُهَا مَأْخُوْذُ مَنَ الْإِسْرَائِيْلِيَاتِ وَلَمْ يُثْبِتْ فِيْهَا عَنِ الْمَعْصُوْمِ حَدِيْثُ يُجِبْ اِتْبَاعِهِ] یعنی یہ قصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ اور پھر لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم نے جو ایک حدیث یزید الرقاشی کی روایت سے بیان کی ہے اس کی سند صحیح نہیں، کیونکہ یزید ضعیف الحدیث ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس قصہ کو ان آیات کی تفسیر ٹھہرانے کے لیے قرآن کریم کے الفاظ کو بھی توڑنا مروڑنا پڑتا ہے۔ مثلاً یہ کہ جو لوگ دیوار پھاند کر آئے وہ دو فرشتے تھے۔ فرشتوں کو دیوار پھاندنے کی کیا ضرورت تھی اور قرآن شریف میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ فرشتے تھے۔ پھر اگر فرشتے تھے تو انہوں نے جھوٹ کیوں بولا اور از سرتا پا ایک جھوٹا قصہ کیوں بنایا۔ اور قرآن کریم کے صریح الفاظ اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ یہاں حضرت داؤد علیہ السلام کی کسی کمزوری کا ذکر ہو۔ بلکہ پہلی اور پچھلی آیات سب ان کے مقام بلند کے اظہار کے لیے ہیں۔ پہلے انہیں ﴿اَوَّابٌ﴾ کہا ہے اور ﴿اَوَّابٌ﴾ وہ ہے جو ترک معاصی اور فعل خیرات کرتا ہے۔ تو اس لفظ کے ساتھ معصیت کا ذکر بالکل ناموزوں ہے۔ پھر انہیں حکمت دینے کا اور ﴿فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ کا ذکر ہے۔ پھر فیصلہ کے وقت حضرت داؤد علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ سوائے مومنوں کے اکثر شرکاء ایک دوسرے پر ظلم ہی کرتے ہیں اور ایسے لوگ جو ظلم سے بچیں بہت کم ہیں۔ یہ استثنا اگر خود ان کو شامل نہیں کرتا تو اور کسے کرتا۔ پھر آیت کا خاتمہ اس پر کیا ﴿اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ﴾ یعنی وہ ہمارے مقربین میں سے تھے۔ پھر اسی واقعہ کے ساتھ انہیں خلیفہ بنانے کا ذکر بطور انعام ہے۔

ابو حیان نے ان آیات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہم ظاہر آیات کو نہیں چھوڑ سکتے کہ دیوار پھاندنے والے انسان تھے اور کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ان سے خوف اس وجہ سے تھا کہ آپ نے خیال کیا کہ یوں بے وقت وہ آپ پر حملہ کرنے کے لیے آئے ہیں کیونکہ آپ اس وقت اکیلے حالت عبادت میں تھے۔ اور جب ان پر واضح ہو گیا کہ وہ ایک مقدمہ لے کر آئے ہیں تو آپ نے اس غلط ظن کی وجہ سے استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کیا۔ اسی کے قریب قریب یہ ہے کہ اصل میں یہ دیوار پھاندنے والے ارادۂ قتل سے آئے تھے لیکن حضرت داؤد علیہ السلام کو بیدار پا کر انہوں نے ایک غلط قصہ بنا لیا کہ ہم مقدمہ کے فیصلہ کے لیے آئے ہیں، تب حضرت داؤد علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ ان سے بدلہ لیں۔ لیکن پھر خیال ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان تھا کہ کیا اپنے نفس کے لیے وہ غضب میں آتے ہیں یا نہیں، سو آپ نے استغفار کیا۔ اور استغفار کے متعلق ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ استغفار ان پر حملہ آوروں کے لیے تھا اور ﴿فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ﴾ میں لام اجل کا ہے یعنی آپ کے استغفار کی وجہ سے ہم نے ان لوگوں کو معاف کر دیا۔ (ر)

ادنیٰ تدبر سے معلوم ہو گا کہ یہ قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے یہاں بیان کیا گیا ہے اور آپ کو بتایا گیا ہے کہ اگر آپ کی

فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

سو ہم نے اس سے اس کی حفاظت کر دی اور اس کے لیے ہمارے ہاں قرب اور اچھی منزلت ہے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾ ع 2 12 11

اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں حاکم بنایا ہے، سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر۔ ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں گی۔ وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بہک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے، اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔ (2834)

مخالفت کی جاتی ہے اور آپ کی جان لینے کے منصوبے کیے جاتے ہیں تو ایسا ہی پہلے نبیوں کے ساتھ بھی ہوا، یہاں تک کہ داؤد علیہ السلام جیسے طاقتور بادشاہ کے خلاف بھی ایسے منصوبے ہوتے رہے۔ چنانچہ یہ ذکر یہاں سے شروع ہوتا ہے ﴿اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ﴾ [17] یعنی اگر تمہیں تکلیفیں دی جاتی ہیں تو صبر کرو اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے نبیوں سے ایسا ہی ہے کہ ان کے دشمن پہلے پہلے انہیں خوب دکھ دیتے ہیں یہاں تک کہ ہمارے طاقتور بندے داؤد کو یاد کرو کہ اسے بھی ایسا معاملہ پیش آیا۔ اور آگے ذکر ہے کہ کس طرح منصوبہ کرنے والوں نے دیوار پھاند کر آپ کا کام تمام کرنا چاہا لیکن آپ کو بیدار پا کر ٹال گئے اور ایک مقدمے کا فیصلہ چاہا۔ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کا منشا آپ کو مار کر ملک لینے کا تھا اس لیے آپ نے انہیں نرمی سے یوں بھی سمجھا دیا کہ شریک ایک دوسرے پر ظلم اور ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اور يَبْغِيْ کے لفظ میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے اور ﴿فَتَنّٰهُ﴾ سے مراد تکالیف و محن ہیں جو اس کے اصل معنی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف اسے اس لیے منسوب کیا کہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوتی ہیں۔ اور استغفار درحقیقت طلب حفاظت کے لیے ہے اور ﴿فَغَفَرْنَا لَهٗ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ ہم نے دشمنوں سے اس کی حفاظت کی۔ اور ﴿ذٰلِكَ﴾ میں اشارہ آپ کے دشمنوں کے منصوبوں کی طرف ہے اور اس کی وجہ یہ فرمائی ہے کہ وہ ہمارے مقرب تھے۔ اور یہ سب گویا رسول اللہ ﷺ کو تسلی ہے کہ آپ کے خلاف بھی ایسے منصوبے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کی بھی حفاظت کرے گا۔ ورنہ اس قصہ کا کوئی تعلق اس سورت سے نہیں۔

2834- یہ خلیفہ بنانا پہلے سے ہے مگر یہاں اس کے لانے میں آنحضرت ﷺ کی بادشاہت کی طرف اشارہ ہے اور خواہشات کی پیروی بادشاہ کے لیے یہ ہے کہ اپنی قوم کے بالمقابل دوسری قوم سے انصاف نہ کرے۔ بادشاہ قوموں کی یہ خواہش آخر کار ان کی تباہی کا موجب ہو جاتی ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ یہ ان کا خیال ہے جو کافر ہیں۔ سو ان پر جو کافر ہیں آگ کی وجہ سے افسوس ہے۔[2835]

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾

کیا ہم ان کو جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح ٹھہرائیں گے، یا کیا ہم متقیوں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے؟[2836]

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾

یہ کتاب جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے برکت دی گئی ہے تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾

اور ہم نے داؤد کو سلیمان دیا، کیا اچھا بندہ تھا۔ وہ بار بار (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا۔

2835- مِنْ تعلیلیہ ہے جیسے ﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ [البقرة: 79:2] ''سو ان کے لیے حسرت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں۔'' میں۔ یعنی اس آگ کی وجہ سے ان پر افسوس ہے جو ان کے فاسد ظن کی وجہ سے ان کے اعمال بد کے نتیجہ میں ملے گی اور مِنْ تبیین کے لیے بھی آتا ہے ﴿مِنْ بَرَدٍ﴾ [النور: 43:24] ''اولے۔'' اور نفی اور استفہام میں استغراق کے لیے ہوتا ہے ﴿فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ﴾ [الحاقة: 47:69] ''پھر تم میں سے کوئی۔'' (غ)

2836- یہ گویا پچھلی آیت کا نتیجہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے اقتضائے حکمت سے پیدا کیا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ متقی اور فاجر یکساں ٹھہریں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان سے یکساں ہو۔ اس لیے ضروی ہے کہ متقیوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں کامیاب کرے اور حق کو قائم کرے اور وہ لوگ جو بدیوں میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں (فُجَّارٌ فَاجِرٌ کی جمع ہے، دیانت کے پردے کو پھاڑ دینے والا [دیکھو نمبر: 88] گویا وہ بدی میں یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ کوئی حجاب باقی نہیں رہ جاتا) انہیں نیست و نابود کر دے۔ ذکر تو حضرت داؤد علیہ السلام کا تھا اور اسی کے تسلسل میں آگے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر آتا ہے، درمیان میں یہ آیات یہی توجہ دلانے کے لیے ہیں کہ یہ قصے نہیں آئندہ کے واقعات ہیں، کہانیاں نہیں سبق ہیں، اس لیے متقی بنو فاجر نہ بنو۔

اِذۡ عُرِضَ عَلَیۡہِ بِالۡعَشِیِّ الصّٰفِنٰتُ الۡجِیَادُ ﴿ۙ۳۱﴾

جب اس پر پچھلے پہر اصیل تیز رو گھوڑے پیش کیے گئے۔(2837)

فَقَالَ اِنِّیۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ ۚ حَتّٰی تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ﴿ٝ۳۲﴾

تو اس نے کہا میں اچھے مال کی محبت کو اپنے رب کے ذکر کی وجہ سے اختیار کرتا ہوں، یہاں تک کہ وہ پردے میں چھپ گئے۔(2838)

2837- ﴿الصّٰفِنٰتُ﴾ صَفْنٌ دو چیزوں کو جمع کرنا ہے ایک کو دوسری سے ملاتے ہوئے۔[صَفَنَ الْفَرْسُ قَوَائِمَهٗ](غ) اور اس کے معنی ہیں تین ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور چوتھی کے سم کو موڑ لیا۔ اور حدیث میں آتا ہے:[قُمْنَا خَلْفَهٗ صُفُوْنًا] یعنی جب رسول اللہ ﷺ رکوع سے سر اٹھاتے ہم آپ کے پیچھے صَافِنٌ ہونے کی حالت میں کھڑے ہوتے تھے۔ جس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ ہر شخص جو پیروں کو برابر کیے کھڑا ہو۔ اور صَافِنٌ کے معنی مطلق کھڑا ہونے والا بھی کیے گئے ہیں۔ اور فراء کا قول ہے کہ عرب لوگ مطلق کھڑا ہونے والے کو صَافِنٌ کہتے ہیں خواہ تین ٹانگوں پر کھڑا ہو یا سب پر۔ اور حدیث میں آتا ہے[مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّقُوْمُ لَهُ النَّاسُ صُفُوْنًا] یعنی جو شخص اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کے لیے مؤدبانہ کھڑے رہیں، جہاں صُفُوْنًا کے معنی واقفین کیے گئے ہیں۔(ل)

﴿الۡجِیَادُ﴾ جَوادٌ کی جمع ہے۔ اور جُوْدٌ سخاوت یعنی مال اور علم کے خرچ کرنے کا کام ہے۔ اور جَوادٌ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بہت سخاوت کرنے والا ہو۔ اور اس گھوڑے کو جو اپنی جمع شدہ دوڑ کی طاقت کو خرچ کرتا ہے۔(غ) یعنی تیز دوڑنے والا گھوڑا۔ اور اسی مادہ سے جَيِّدٌ ہے جو رَدِیٌّ کا نقیض ہے۔

2838- ﴿الۡخَیۡرِ﴾ بہت اور اچھے مال کو کہتے ہیں۔[دیکھو نمبر: 220] اور مفسرین نے لکھا ہے کہ عرب کے لوگ خَیۡلٌ یعنی گھوڑوں کو بھی خَیۡرٌ کہتے ہیں۔(ر)

﴿عَنۡ﴾ بہت سے معنی کے لیے آتا ہے اور ایک چیز سے تجاوز جو اس کے عام معنی ہیں اور بدل کے معنی میں بھی آتا ہے ﴿لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا﴾[البقرۃ: 48:2] ''جب کوئی جی کسی جی کے کچھ کام نہیں آئے گا۔'' تعلیل کے لیے جیسے ﴿وَ مَا کَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰہِیۡمَ لِاَبِیۡہِ اِلَّا عَنۡ مَّوۡعِدَۃٍ﴾[التوبۃ: 114:9] ''اور ابراہیم کا اپنے بزرگ کے لیے بخشش مانگنا صرف ایک وعدے کی وجہ سے تھا۔'' ﴿وَ مَا نَحۡنُ بِتَارِکِیۡۤ اٰلِہَتِنَا عَنۡ قَوۡلِکَ﴾[ھود: 53:11] ''اور ہم تیرے کہنے پر اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں۔'' بعد کے معنی میں جیسے ﴿عَمَّا قَلِیۡلٍ لَّیُصۡبِحُنَّ نٰدِمِیۡنَ ﴿ۚ۴۰﴾﴾[المؤمنون: 40:23] ''تھوڑی ہی دیر میں یقیناً پشیمان ہوں گے۔'' ﴿لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿ؕ۱۹﴾﴾[الانشقاق: 19:84] ''تم ضرور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف چڑھو گے۔'' مراد ہے ایک حالت کے بعد دوسری حالت۔ مِنۡ کے معنی میں جیسے ﴿یَقۡبَلُ التَّوۡبَۃَ عَنۡ عِبَادِہٖ﴾[التوبۃ: 104:9]

رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

انہیں میرے پاس لوٹا کر لاؤ۔ تب وہ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ (2839)

''اللہ ہی اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے۔'' ﴿نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا﴾ [الأحقاف: 16:46] ''ہم ان کے بہترین عمل قبول کرتے ہیں۔'' ب کے معنی میں جیسے ﴿وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝﴾ [النجم: 3:53] ''اور نہ خواہش نفس سے بولتا ہے۔'' (مغنی) یہاں عَنْ تعلیل کے لیے ہے یعنی اپنے رب کے ذکر کی وجہ سے۔

2839- ﴿فَطَفِقَ﴾ [طَفِقَ يَفْعَلُ كَذَا - اَخَذَ يَفْعَلُ كَذَا] کی طرح ہے یعنی وہ کام کرنے لگ گیا۔ ﴿وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ﴾ [الأعراف: 22:7] ''اور ڈھانکنے لگے۔''

حضرت سلیمانؑ اور گھوڑوں کا واقعہ:

اس واقعہ کو بھی عجوبہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے یہاں تک کہ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ پروں والے گھوڑے تھے۔ اور لفظ عَنْ کے صحیح معنی یہاں نہ لینے کی وجہ سے یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کی دوڑ کو دیکھتے رہے اور نماز ترک کر دی اور تب اپنے اس قصور سے توبہ یوں کی کہ سب گھوڑوں کو اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالا جو ایک ہزار یا بیس ہزار تھے۔ اگر عصر کی نماز گھوڑ دوڑ کے دیکھنے میں قضا ہوئی تو مغرب اور عشا گھوڑوں کے مارنے میں قضا ہو گئی ہوں گی۔ قرآن کریم نے ایک سیدھا سادہ واقعہ لکھا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ تھے، وسیع سلطنت تھی، انہیں گھوڑے بھی رکھنے پڑتے تھے، اچھے اچھے خوبصورت گھوڑے منگواتے اور رکھتے لیکن بتایا ہے کہ یہ گھوڑوں کی محبت کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ اہل دنیا کا خیال ہوتا ہے، بلکہ یہ محبت ﴿عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ﴾ تھی۔ یعنی اس لیے کہ یہ گھوڑے بھی خدا کی راہ میں جہاد میں کام آتے تھے۔ اور ﴿حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ میں انہی گھوڑوں کا دور نکل جانا اور نظر سے غائب ہو جانا مراد ہے۔ ان کی دوڑ کو دیکھ کر آپ خوش ہوئے اور ان گھوڑوں کو اپنے ہاتھ سے تھپکی دینی شروع کی، کاٹنے کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ بخاری میں موجود ہے [يَمْسَحُ أَعْرَافَ الْخَيْلِ وَعَرَاقِيبَهَا] (صحيح البخاری، كتاب احاديث الانبياء، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى (وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ) یعنی گھوڑوں کے ایال اور پاؤں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور نہ سورج کے غروب ہونے کا ذکر ہے۔ اور ان باتوں کا ذکر کرنے سے بتانا یہ مقصود ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کو خدا کی راہ میں گھوڑوں سے کام لینا ہوگا۔ مگر یہ دنیا کے **مال کی محبت** کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ صرف اس لیے کہ وہ خدا کی راہ میں کام آئیں گے۔ انبیاء کو ظاہری شان و شوکت سے کوئی وابستگی نہیں ہوتی اور مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ سلطنت ملے تو اسے صرف دین کا خادم سمجھیں اصل مقصود نہ بنالیں۔ مال دنیا صلحا کے پاس بھی آتا ہے مگر اس کی عظمت ان کی نگاہ میں نہیں ہوتی۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَ اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے سلیمان کو امتحان میں ڈالا اور اس کے تخت پر ایک جسم کو ڈالا، پھر اس نے رجوع کیا۔ (2840)

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

کہا میرے رب! میری حفاظت فرما اور مجھے وہ بادشاہت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو شایاں نہیں (کہ چھین لے) تو بہت عطا فرمانے والا ہے۔ (2841)

2840- ﴿جَسَدًا﴾ جَسَدٌ اور جسم کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن جَسَدٌ خاص ہے کیونکہ جَسَدٌ وہ ہے جس کا کوئی رنگ ہو اور جسم میں یہ ضروری نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جَسَدٌ صرف انسان کے جسم سے خاص ہے۔ (غ) اور جِسْمٌ کی جمع اَجْسَامٌ ہے۔ ﴿تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ﴾ [المنافقون: 4:63] ''تو ان کے جسم تجھے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔''

حضرت سلیمانؑ کا بیٹا:

حدیث میں ہے کہ حضرت سلیمان ﷺ نے کہا تھا میں سو یا ننانوے بیبیوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ان میں سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوگا اور انشاء اللہ نہیں کہا تھا۔ تو صرف ایک بی بی حاملہ ہوئی اور اس سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا [جَاءَتْ بِشِقِّ رَجُلٍ] (صحيح البخاری، كتاب الجهاد، باب مَنْ طَلَبَ الْوَلَدَ لِلْجِهَادِ، حديث:2819) آیا اس سے مراد جسمانی طور پر ادھورا ہے یا اخلاقی طور پر۔ مفسرین نے جسمانی طور پر ادھورا لیا ہے اور اس کے تخت پر ڈالنے کے یہ معنی صحیح نہیں کہ دائی نے بچہ لا کر تخت پر رکھ دیا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا جانشین بلحاظ اخلاق وقوت ادھورا تھا اور تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے۔ [دیکھو نمبر: 2685] جہاں سلیمان علیہ السلام کے جانشین کا ذکر ہے۔ اور ﴿ثُمَّ اَنَابَ﴾ فرمایا کیونکہ گو حضرت سلیمان علیہ السلام پہلے ہی اَوَّاب تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا جانشین کسی قابل نظر نہیں آتا تو اور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جو یہاں بعض مفسرین نے قصہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان وشوکت اور شیاطین اور جنوں کا ان کے ماتحت ہونا ایک انگشتری کی وجہ سے تھا جس پر اسم اعظم تھا اور **وہ انگشتری ایک شیطان نے چرالی** اور وہ سلیمان بن گیا اور پھر اس قصہ کو طول دیا ہے، تو یہ سب لچر حکایات ہیں جن سے قرآن کریم جیسی پُرحکمت کتاب پاک ہے۔

2841- **حضرت سلیمانؑ کی اس دعا کا کیا منشا ہے؟** کیا یہ مطلب ہے کہ وہ سچ مچ دنیا کی بڑی بھاری بادشاہت کے طالب تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اتنی بڑی حکومت آپ کے بعد کسی کو نہ ملے۔ یہ دونوں باتیں شان نبوت کے خلاف ہیں۔ دنیا کی حکومت اور دنیا کے مال و دولت کی طلب یا محبت انبیاء کے دلوں میں قطعاً نہیں ہوتی۔ پھر اتنی بڑی ہوس کا کیا ذکر کہ یہ بھی خواہش ہو کہ میرے بعد ایسی حکومت دنیا میں کسی کو نہ ملے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں سحر کا زور تھا تو

آپ کو معجزہ ایسا دیا گیا جو تمام سحروں سے بڑھ کر تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شفائے امراض پر زور تھا اس لیے آپ کو معجزہ شفائے امراض کا دیا گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فصاحت پر فخر تھا تو آپ کو بلحاظ فصاحت ایسا معجزہ دیا گیا جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں لوگوں کو حکومت اور بادشاہت پر فخر تھا اس لیے آپ کو ایسی حکومت دی گئی۔ لیکن یہ دلیل نہایت بودی ہے، اس لیے کہ معجزات انبیاء اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے نہیں لیا کرتے۔ نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا سے سانپ بننے کی دعا کی، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بیماروں کو اچھا کرنے کی، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فصاحت کے لیے دعا کی۔ پھر دوسری دقت یہ ہے کہ اس کو تخت پر جسد کے ڈالنے سے کیا تعلق ہے۔ جن مفسرین نے جسد کے ڈالنے سے شیطان کا خاتم سلیمان پہن کر سلیمان ہو جانا مراد لیا ہے انہوں نے اس کی توجیہ یوں کی ہے [هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ غَيْرِيْ مِمَّنْ هُوَ فِيْ عَصْرِيْ اَنْ يَّسْلِبُهُ مِنِّيْ كَهٰذِهِ السُّلْبَةِ] اور معنی عطاء اور قتادہ سے مروی ہیں۔ یعنی مجھے ایسا ملک دے جو کسی میرے اہل زمانہ کے لیے شایاں نہ ہو کہ وہ مجھ سے چھین لے جس طرح اس دفعہ چھین لیا گیا ہے۔ اور روح المعانی میں خاتم سلیمان کے قصہ کو چونکہ رد کیا گیا ہے اس لیے اس قدر تغیر کے ساتھ اس توجیہ کو قبول کیا گیا ہے کہ یہ دعائے عدم سلب ملک ہو سکتی ہے گو پہلے سلب نہ ہوا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا دوام چاہنا اچھی دعا ہے۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی بادشاہت عطا فرمائے جو کسی دوسرے کے لیے شایاں نہیں کہ ان سے چھین سکے اور یہی صحیح ہے۔ اور یہ دعا آپ نے اس لیے کی کہ آپ کو اپنے بعد اس بادشاہت کی جو اس قدر محنت سے بنائی تھی بری حالت دکھائی گئی۔ اور بَعْدَ یہاں بمعنی غَیْر ہے جیسے ﴿فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ﴾ [الجاثیۃ: 23:45] ''اللہ کے بعد کون اسے ہدایت دے سکتا ہے۔'' میں مراد [عَنْ غَيْرِ اللّٰهِ] ہے۔ لیکن چونکہ مُلْك ظاہری بادشاہت پر بھی بولا جاتا ہے اور نبوت یا دینی بادشاہت پر بھی [دیکھو نمبر: 127 و نمبر: 397]۔ اس لیے میرے نزدیک ترجیح اس بات کو ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا باطنی ملک کے لیے کی ہے نہ ظاہری ملک کے لیے۔ یعنی وہ دیکھتے ہیں کہ یہ حکومت اور یہ جاہ و جلال تو چلا جائے گا لیکن اللہ تعالیٰ کا نام دنیا میں بلند کرنے سے جو ملک حاصل ہوتا ہے اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ پس وہ اعلائے کلمۃ اللہ یا اللہ کے نام کی حکومت چاہتے ہیں۔ کیونکہ جو حکومت ظاہر طور پر حاصل ہوتی ہے وہ دوسرا چھین سکتا یا برباد کر سکتا ہے۔ لیکن جو حکومت روحانی طور پر حاصل ہوتی ہے یعنی جس کا تعلق اخلاق سے ہے اسے دوسرا نہیں چھین سکتا۔ جسموں پر حکومت زائل ہو جاتی ہے لیکن دلوں پر جو حکومت ملتی ہے وہ کبھی زائل نہیں ہوتی۔ اور اس کی تائید خود اس سے ہوتی ہے کہ دو دعائیں اکٹھی ہیں یعنی ① ﴿اغْفِرْ لِيْ﴾ اور ② ﴿هَبْ لِيْ مُلْكًا﴾ دعائے غفران انسان کے باطن یا اخلاق سے تعلق رکھتی ہے نہ حکومت ظاہری سے۔ اور دوسری جگہ جہاں قرآن کریم میں ﴿مُلْكِ سُلَيْمٰنَ﴾ [البقرۃ: 102:2] ''سلیمان کی نبوت۔'' کا ذکر ہے تو وہاں مراد ان کا دین یا ان کی نبوت ہی ہے۔ [دیکھو نمبر: 127] اور ظاہری حکومت کو وارث کے ذریعہ سے جاتے دیکھ کر یہ تڑپ آپ کے دل میں پیدا ہوئی کہ آپ کی حکومت دلوں پر ہو اور اسی کے قریب قریب سید مرتضیٰ کا قول ہے [اِنَّمَا سَاَلَ مُلْكَ الْاٰخِرَةِ وَ ثَوَابَ الْجَنَّةِ] ''اس میں ملک آخرت اور ثواب جنت کی طلب ہے۔'' (ر)

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾

سو ہم نے اس کے لیے ہوا کو کام میں لگا یا وہ اس (اللہ) کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی جدھر وہ قصد کرے۔ (2842)

حدیث عفریت:

اور حدیث میں جو آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایک عفریت نے رات کے وقت میری نماز کو خراب کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت دے دی اور میں نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستون سے باندھ دوں۔ پھر مجھے سلیمان کا قول یاد آ گیا [رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِ] (صحيح البخاری، كتاب الصلوٰة، باب الأَسِيرِ أَوِ الْغَرِيمِ يُرْبَطُ فِي الْمَسْجِدِ ، حديث: 461) تو اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو میں نے لکھی ہے۔ اور جنوں پر حکومت اس سے مراد نہیں کیونکہ حدیث میں صاف لفظ ہیں [فَأَمْكَنَنِي اللهُ مِنْهُ] (صحيح البخاری، كتاب الصلوٰة، باب الأَسِيرِ أَوِ الْغَرِيمِ يُرْبَطُ فِي الْمَسْجِدِ ، حديث: 461) اللہ تعالیٰ نے اس جن پر مجھے قدرت دے دی اور اسے میرے قابو میں کر دیا۔ اور یہ صریح الفاظ اس خیال کو غلط ٹھہراتے ہیں کہ جنوں پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد کسی کو قدرت نہیں مل سکتی۔ اور اصل تو یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے جن انسان ہی تھے اور یہ عفریت جس نے نبی کریم ﷺ کو تکلیف دی یہ بھی کوئی سرکش انسان ہی تھا اور آنحضرت ﷺ کا اسے چھوڑ دینا اور ﴿هَبْ لِيْ مُلْكًا﴾ کو یاد کر کے سزا نہ دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سزا تو حکومت جسمانی سے دی جاتی ہے اور آپ کی حکومت روحانی یا دلوں پر ہونی ضروری تھی۔ اور یہ فعل چونکہ آپ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ایسے آدمی کو معاف کر دینا گویا اس کے دل پر قبضہ کر لینا تھا۔ ہاں جہاں اسلام کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئیں تو آپ نے سزا بھی دی۔ اور اس سارے قصہ کو یہاں بیان کرنے کی غرض بھی مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ حکومت ظاہری جا بھی سکتی ہے اور چلی جائے گی، لیکن باطنی حکومت یا دلوں پر حکومت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ آج وہ بادشاہت بہت کچھ مسلمانوں سے چھن چکی ہے جو کبھی انہیں دنیا میں حاصل تھی، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کو جو حکومت قلوب پر حاصل ہے اس کے سامنے آج بھی بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں جھکتی چلی جاتی ہیں۔ یہی وہ ملک آپ کو بھی ملا جو ﴿لَا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ﴾ کا مصداق ہوا، جسے کوئی عیسائی طاقت نہیں چھین سکتی بلکہ جس کے سامنے خود عیسائی طاقتیں جاتی رہیں گی۔ اور ظاہری سلطنت جو آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دی گئی وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے بہت بڑھ کر تھی اور یہ سارا ذکر اصل میں مسلمانوں کی حالت کا نقشہ ہے۔ جس طرح سلیمان علیہ السلام کی سلطنت ظاہری پر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کے تخت پر ایک جسد تھا، اسی طرح مسلمانوں کی حالت ہوئی کہ وہ حکومت جو دنیا میں ان کو ملی ایسے لوگوں کے سپرد ہوئی جو اس کے اہل نہ تھے [آیت نمبر: 28] میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور ان آیات میں یہی توجہ دلا کر مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ حکومت ظاہری چھن جائے تو اس حکومت باطنی کی طرف توجہ کریں جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔

2842- ﴿رُخَآءً﴾ رُخَآءٌ لینت یعنی نرمی کو کہتے ہیں اور اسی سے استعارۃً [اَرْخَاءَ السِّتْرُ] لیا گیا ہے یعنی پردہ کا چھوڑ دینا۔ (غ)

وَ الشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ اور شیطانوں کو ہر ایک معمار اور غوطہ زن کو (ان کے کام میں لگایا)۔ (2843)

وَّ اٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ اور اَوروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔ (2844)

﴿اَصَابَ﴾ صَوَابَ دو طرح پر ہے۔ ایک کسی چیز کی اپنی ذات کے اعتبار سے یعنی جب کوئی چیز اپنی ذات میں محمود ہو اور مقتضائے عقل و شریعت سے پسندیدہ ہو تو اسے صَوَابٌ کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا قصد کرنے والے کے اعتبار سے جب وہ مقصود کو پالے۔ جب [اَصَابَ كَذَا] کے معنی ہوتے ہیں جو طلب کیا تھا پالیا جیسے [اَصَابَ السَّهْمُ] یعنی تیر نشانے پر لگا۔ اور مُصِيْبَةٌ اصل میں تیر پھینکنے میں ہے پھر دکھ پہنچنے کے لیے مخصوص ہوگئی ہے۔ ﴿اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا﴾ [آل عمران: 165:3] ''اور کیا جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی کہ اس جیسی دو چند تم پہنچا چکے ہو۔'' ﴿وَ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ [الشوریٰ: 30:42] ''اور جو تم پر مصیبت پڑتی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔'' اور اَصَابَ خیر اور شر دونوں میں آتا ہے۔ ﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ﴾ [التوبة: 50:9] ''اگر تجھے بھلائی پہنچے انہیں برا لگتا ہے اور اگر تجھے تکلیف پہنچے۔'' ﴿وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [النسآء: 73:4] ''اور اگر تم کو اللہ کی طرف سے فضل پہنچے۔'' (غ) اور یہاں اَصَابَ بمعنی [قَصَدَ وَ اَرَادَ] ہے جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ (ر)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کے مسخر ہونے پر [دیکھو نمبر: 2175] اور اسی ہوا کو ﴿عَاصِفَةً﴾ [الأنبیآء: 81:21] ''تیز چلنے والی۔'' بھی کہا ہے جس کے لیے دیکھو نوٹ مذکورہ بالا اور ہوا کی تسخیر سے مراد یہی ہے کہ ہوا سے ان کے کام نکلتے تھے جیسے جہازوں کا چلنا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ﴾ [إبراهيم: 33:14] ''اور سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا۔'' اور ایسا ہی اور چیزوں کی انسان کے لیے تسخیر کا ذکر ہے حتی کہ ایک جگہ فرمایا: ﴿وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ [الجاثية: 13:45] ''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو (اپنے فضل سے) تمہارے کام پر لگایا۔'' اور یہاں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے کام میں لگانا اسی دعا کا نتیجہ تھا جو اوپر مذکور ہے۔ ﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا﴾ مگر مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس ظاہری حکومت کے دلدادہ نہ تھے اور ان کے دل میں کوئی تڑپ تھی تو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے تھی اور اسی بات کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ظاہری حکومت میں سب قسم کے سامان عطا فرمائے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے سرکش آپ کے مطیع ہو گئے تاکہ وہ اس کے نام کو بلند کریں اور یہی اگلی دو آیات کا مضمون ہے۔

2843- ﴿بَنَّآءٍ﴾ بِنَاءٌ عمارت اور بنانا ہے اور ﴿بَنَّآءٍ﴾ بنانے والا یعنی معمار۔

2844- ﴿الْاَصْفَادِ﴾ صَفَدٌ اور صَفَادٌ کے معنی غُلّ یعنی طوق ہیں اور جمع اَصْفَادٌ ہے اور صَفَدٌ کے معنی عطیہ بھی ہیں۔ (غ)

ان شیاطین کے متعلق [نمبر: 2176] میں بحث گزر چکی ہے۔ معماری کا کام کرنے والے اور **غوطہ زن** انسان ہی ہو سکتے ہیں اور

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾

یہ ہماری عطا بے حساب ہے۔ سو احسان کر یا روک رکھ۔ (2845)

ع 3 14 12 وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ ع

اور اس کے لیے ہمارے ہاں قرب اور اچھی منزلت ہے۔

وقف لازم وَ اذْكُرْ عَبْدَنَاۤ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ﴿۴۱﴾ ط

اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کر۔ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے تکان اور تکلیف پہنچائی ہے۔ (2846)

اگر معمار **سچ مچ کے شیاطین** تھے تو مزدور کون تھے اور ان کا زنجیروں میں جکڑا ہوا ہونا صاف بتاتا ہے کہ وہ غیر مرئی ہستیاں نہیں جو ناری مخلوق ہے بلکہ ایسے اجسام ہیں جو زنجیروں میں جکڑے جا سکتے ہیں۔ اور یہ کہنا کہ وہ مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں بے سند بات ہے اور علاوہ ازیں یہ تو ان کا اختیار ہوا کہ کوئی شکل اختیار کر لیں۔ اگر ایسی شکل اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ زنجیروں میں جکڑ لیے جاتے تو وہ فوراً کیوں اپنی شکل اختیار کر کے آزاد نہ ہو جاتے۔

2845- ﴿فَامْنُنْ﴾ مَنَّ کے لیے [دیکھو نمبر: 337] کسی پر احسان کرنا اور مَنَّ بلا عوض چھوڑ دینے پر بھی بولا جاتا ہے ﴿فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً﴾ [محمد: 4:47] ''پھر بعد میں یا تو احسان کے طریق پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو'' اور یہاں مطلب خرچ کرنا ہے۔ (غ) اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں انہیں آزاد کر دو یا قید رکھو۔ (ر) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری قوموں کے قیدی تھے۔

2846- **حضرت ایوبؑ کا ذکر** [الأنبیآء: 83, 84] میں گزر چکا ہے۔ ابن جریر حضرت ایوب علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کے پوتے کا پوتا قرار دیتے ہیں اور ابن عساکر لکھتے ہیں کہ ان کی ماں لوط علیہ السلام کی بیٹی تھی۔ اور ایک قول ہے کہ وہ سلیمان علیہ السلام کے بعد ہوئے۔ (ر) ایوب کی کتاب مجموعہ بائبل میں زبور سے پہلے رکھی گئی ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ صرف ایک قصہ ہے اور حضرت ایوب علیہ السلام کوئی تاریخی انسان نہ تھے۔ مگر [حزقیل: 14:14] میں حضرت ایوب علیہ السلام کا نام حضرت نوح علیہ السلام اور دانیال کے ساتھ لیا گیا ہے اور یہودیوں نے انہیں ہمیشہ ایک تاریخی انسان سمجھا ہے۔ اور تازہ ترین تحقیقات یہ ہے کہ وہ ایک تاریخی انسان تھے۔ لیکن بائبل میں جو کتاب ایوب کے نام سے ایک کتاب ہے وہ بعد کی تصنیف ہے۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسطین کے مشرق کے رہنے والے تھے اور ایک بڑے سردار کی حیثیت رکھتے تھے اور بہت سے مال و دولت کے مالک تھے۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾

اپنی ایڑی لگائے چل، یہ ٹھنڈا (پانی) نہانے اور پینے کو ہے۔ (2847)

2847- ﴿مُغْتَسَلٌ﴾ غَسَلَ (مصدر غُسل) کے معنی ہیں ایک چیز پر پانی بہایا اور اس کی میل کو دور کر دیا ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ﴾ [المآئدۃ: 6:5] ''تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ دھولیا کرو۔'' اور اِغْتِسَالٌ بدن کا دھونا ہے ﴿حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا﴾ [النسآء: 43:4] ''یہاں تک کہ غسل کرلو۔'' اور مُغْتَسَلٌ نہانے کی جگہ ہے اور وہ پانی جس سے نہایا جائے۔ غِسْلِيْنٍ کفار کے بدنوں کا دھون ہے۔ ﴿وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۙ﴾ [الحاقۃ: 36:69] ''اور نہ دھوؤں کے سوائے کوئی کھانا ہے۔'' (غ)

﴿شَرَابٌ﴾ شُرْبٌ ہر ایک سیال چیز کا نوش کرنا ہے پانی ہو یا کچھ اور۔ (غ) اور شراب وہ چیز ہے جو پی جائے خواہ وہ کسی نوع سے ہو اور کسی حال پر ہو۔ (ل) اور شَارِبٌ پینے والا ﴿لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ﴾ [محمد: 15:47] ''پینے والوں کے لیے لذت ہے۔'' اور مونچھوں کے بالوں کو شَارِبٌ کہا جاتا ہے جس کی جمع شَوَارِبٌ ہے۔ گویا وہ پینے والوں کی صورت پر ہیں۔ (غ)

حضرت ایوبؑ کی تکالیف:

پچھلی آیت میں لفظ نصب آیا تھا جس کے معنی تکان ہیں [دیکھو نمبر: 1360] اور یہاں فرمایا ﴿اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ﴾ اور رَكْضٌ سواری کے دوڑانے اور چلنے کو کہا جاتا ہے [دیکھو نمبر: 2135] اور یہاں ﴿بِرِجْلِكَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد سواری کا دوڑانا ہے۔ یہ دونوں لفظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی تکالیف جن کا ذکر یہاں اور قرآن کریم میں دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے ﴿اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾ [الأنبیآء: 83:21] ''مجھے تکلیف پہنچی ہے۔'' کسی سفر سے تعلق رکھتی ہیں جن میں وہ اپنے اہل وعیال اور اپنے ساتھیوں سے جدا ہو گئے ہیں۔ اور یہاں فرمایا: ﴿مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ﴾ اور دوسری جگہ صرف یہ الفاظ ہیں: ﴿اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾۔ جس سے معلوم ہوا کہ تکلیف اور دکھ کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یہ مراد نہیں کہ شیطان کو تکلیف پہنچانے کی کوئی خاص قدرت حاصل ہے۔ اور قرآن کریم میں صراحت سے فرمایا کہ **شیطان کا کام صرف وسوسہ اندازی** ہے ﴿يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾ [الناس: 5:114] ''لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔'' ﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ [الأعراف: 20:7] ''پھر شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ ڈالا۔'' مگر انبیاء وسوسہ شیطانی سے بھی محفوظ ہیں۔ اور دکھ تکلیف یا غلطی کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَ مَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ﴾ [الکھف: 63:18] ''اور شیطان نے یہ مجھے بھلا دیا کہ اس کا ذکر کروں۔'' اور غلبہ کسی قسم کا بھی شیطان کو انسان پر حاصل نہیں، ﴿وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ﴾ [ابراھیم: 22:14] ''اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا۔ مگر میں نے تمہیں بلایا تو تم نے میری بات مان لی۔'' اور یا شیطان سے مراد یہاں کوئی شیطان صفت دشمن ہے جس نے شرارت سے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے اور ان تکالیف کی وجہ سے آپ کو ہجرت کرنی پڑی ہے۔ اور یہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں بشارت دی ہے کہ آگے چلے چلو ان تکلیفوں کا ازالہ ہو جائے گا۔ اگر انہیں کوئی جسمانی بیماری تھی جیسا کہ بائبل میں ذکر ہے تو کسی ایسے چشمہ پر پہنچا دیا جس میں نہانے سے اور

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَ ذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾

اور ہم نے اسے اس کے اہل اور ان کی مثل ان کے ساتھ دیئے۔ (یہ) ہماری طرف سے رحمت (تھی) اور خالص عقل والوں کے لیے نصیحت ہے۔ (2848)

وَ خُذْ بِیَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

اور اپنے ہاتھ میں جھاڑو لے اور اس سے مار اور قسم نہ توڑ۔ ہم نے اسے صابر پایا، کیا اچھا بندہ تھا۔ وہ بار بار (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا۔ (2849)

جس کا پانی پینے سے وہ بیماری دور ہوگئی اور یا نہانے کی غرض محض تکان کا دور کرنا ہے۔

2848- اس پر [نمبر: 2178] میں بحث گزر چکی ہے اور چونکہ اھل کا لفظ دینی اتحاد رکھنے والوں پر بھی بولا جاتا ہے [دیکھو نمبر: 137] اس لیے ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے پیرو جوان سے جدا ہو گئے تھے وہ بھی انہیں مل گئے اور جہاں ہجرت کر گئے تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے اور پیرو بھی دے دیئے۔ دوسرے انبیاء کے ذکر میں آنحضرت ﷺ کا ذکر برابر موجود ہے اور حضرت ایوب علیہ السلام کے ان واقعات کو ذکر کر کے یہی بتایا ہے کہ جس طرح انہیں ایک لمبے زمانے تک تکلیفیں اٹھا کر آخر ہجرت کرنی پڑی ایسا ہی معاملہ آپ کے ساتھ ہوگا۔ اور جس طرح انہیں ان کے اہل اور اس کی مثل مل گئے، اسی طرح آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہوگا۔ اگر بی بی معنی لیے جائیں تو آنحضرت ﷺ کے مکی مصائب میں آپ پر یہ کم مصیبت نہ تھی کہ آپ کی غمگسار بی بی کا انتقال ہو گیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں جا کر آپ کو اور ازواج مطہرات عطا فرمائیں۔ اور اگر پیرو معنی لیے جائیں تو ہجرت میں صحابہ سے جدا ہو کر پھر مدینہ پہنچ کر نہ صرف وہ صحابہ ہی مل جاتے ہیں بلکہ اتنی یا اس سے بڑھ کر تعداد انصار کی بھی مل گئی۔

2849- ﴿ضِغْثًا﴾ ضِغْثٌ کے ایک معنی [نمبر: 1545] میں بیان ہو چکے ہیں۔ اور ﴿ضِغْثًا﴾ مختلف شاخوں کی مٹھی کو بھی کہتے ہیں جن کی جڑ ایک ہو اور اس لیے جھاڑوں کو بھی کہا جاتا ہے یا نبات سے وہ چیز جو کف کو بھر دے۔ اور ایک قول ہے کہ کوئی چیز جو مٹھی میں لی جائے وہ ﴿ضِغْثًا﴾ ہے اور حدیث میں آتا ہے [وَمِنْهُمُ الْآخَذِ الضِّغْثِ] (کنزالعمال فی سنن اقوال، جلد15، صفحہ378، حدیث:41462) جس سے مراد ہے [مِنْهُمْ مِنْ مَّالِ الدُّنْيَا شَيْئًا] ان میں سے وہ ہے جسے دنیا کا کچھ مال مل جائے۔ (ل)

﴿فَاضْرِبْ﴾ ضَرَبَ کے معنی (مارنا) مشہور ہیں (مگر یہ متعدی ہے اور یہاں مفعول مذکور نہیں) اور ضَرْبٌ کے معنی [اِسْرَاعَ فِی السَّيْرِ] ہیں یعنی چلنے میں جلدی کرنا اور اس معنی میں حدیث میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ [ضَرَبَ يَعْسُوبُ الدِّينَ بِذَنَبِهِ.] (مصنف ابن أبي شيبة، جلد15، صفحہ 23) یعنی فتنوں کے خوف سے زمین میں تیز چلا اور بعض نے ذَنَبِہٖ کے

وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾

اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کر (جو) قوت والے اور بصیرت والے (تھے)۔

معنی اَتْبَاعِہٖ کیے ہیں۔ یعنی اپنے پیروؤں کے ساتھ چلا۔ اور [جَاءَ فُلَانٌ يَضْرِبَ] کے معنی ہیں تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ اور [ضَرْبَ الْمَجْدَ] کے معنی ہیں کَسَبَ یعنی بزرگی حاصل کی۔ (ر)

﴿تَحَنُّثٌ﴾ حِنْثٌ قسم کی خلاف ورزی ہے اور حنث یہ بھی ہے کہ انسان حق کو چھوڑ کر کوئی بات کہے اور حنث بڑے گناہ یا شرک کو کہتے ہیں۔ ﴿وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۚ﴾ [الواقعة: 46:56] ''اور بڑے گناہ پر اصرار کرتے تھے۔'' اور تَحَنَّثَ کے معنی ہیں عبادت کی۔ گویا حنث یعنی گناہ کا ازالہ کیا۔ جیسے حدیث میں ہے [وَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ.] (صحيح البخارى، كتاب بدء الوحي، باب (...) حديث: 3) (ل)

حضرت ایوبؑ کے جھاڑو سے مارنے کا قصہ:

ان الفاظ کے معنی یوں کیے گئے ہیں کہ جھاڑو ہاتھ میں لے اور اس سے (اپنی بی بی) کو مار اور قسم نہ توڑ۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیماری کے ایام میں قسم کھالی تھی کہ وہ سو کوڑا اپنی بی بی کو لگائیں گے، لیکن چونکہ اس بی بی نے ان کی بڑی خدمت کی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا یابی پر انہیں یہ حکم دیا کہ سو تنکوں کا ایک جھاڑو لے کر اپنی بی بی کو مار لو اور یوں قسم پوری کرلو، اور پھر اس کی بنا پر جواز حیلہ کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ اور دو تین حدیثیں بھی بیان کی جاتی ہیں جو اعلیٰ پایہ کی نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک ایسے شخص نے ارتکاب زنا کیا جو چل پھر نہ سکتا تھا تو آپ نے اسے سو تنکے کا ایک جھاڑو مروانے پر اکتفا کیا۔ اور ایسا ہی ذکر ایک بیمار اور ایک بوڑھے کے متعلق ہے۔ لیکن حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق جو قصہ بیان کیا جاتا ہے وہ بائبل میں مذکور نہیں اور نہ حدیث میں ہے۔ اور پھر قرآن کریم کے الفاظ میں اتنا کچھ بڑھانا پڑتا ہے اور قسموں کا اس طرح پورا کرنا حیلوں کا دروازہ کھولنا ہے جس سے قسم کی کچھ وقعت باقی نہیں رہ سکتی۔ اور آنحضرت ﷺ کا فعل اگر یہ حدیثیں صحیح ہوں تو صرف یہ بتاتا ہے کہ حالات کے ماتحت سزا میں نرمی کر دینی چاہیے۔ اور یہاں اگر جھاڑو ہی معنی لیے جائیں تو ہوسکتا ہے کہ مراد صرف یہ ہو کہ اپنے دشمنوں پر جب قابو ملے تو ان سے ایسا معاملہ کرو جیسا کوڑوں کی جگہ ایک جھاڑو سے مار لیا جائے۔ کیونکہ اعداء کا ذکر مفہوم میں داخل ہے اور کامیابی پر ان کو سزا دینا ایک قدرتی امر ہے اور شاید اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ نبی کریم ﷺ کا معاملہ نرمی اور تخفیف میں اپنے اعدا سے کیا ہوگا۔ اور حق تو یہ ہے کہ آپ نے ایک جھاڑو لے کر بھی کسی کو نہیں مارا بلکہ اپنے سارے کے سارے دشمنوں کو فتح مکہ پر معاف کر دیا۔ اور ہوسکتا ہے کہ مراد صرف اس قدر ہو کہ مال دنیا سے جو حصہ دیا جاتا ہے وہ لے لو اور اس کے ساتھ مجد یا بزرگی کو کماؤ اور اللہ تعالیٰ کی معصیت نہ کرو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ مال دنیا کو اصل چیز سمجھ کر اس سے محبت کرنے لگو۔ اور اسی قسم کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق بھی تھا، اس لیے یہ معنی زیادہ موزوں ہیں۔ اور اسی طرح قرآن کریم میں کچھ بڑھانے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۚ﴿۴۶﴾	ہم نے انہیں ایک خالص بات سے خالص کرلیا (یعنی آخرت کے) گھر کی یاد سے۔(2850)
وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ؕ﴿۴۷﴾	اور وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ لوگوں (اور) نیکوں میں سے تھے۔(2851)
وَ اذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ وَ كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ؕ﴿۴۸﴾	اور اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو یاد کر اور وہ سب نیکوں میں سے تھے۔

2850- ﴿خَالِصَةً﴾ خَالِصٌ اور خَالِصَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ (ت) اس میں اسی طرح ہے جیسے دَاهِيَةٌ۔ رَاوِيَةٌ۔ (غ) اور کہا جاتا ہے [هٰذَا الشَّيْءُ خَالِصَةً لَكَ] یعنی یہ چیز خاص کر تیرے لیے ہے۔ ﴿مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا﴾ [الأنعام: 139:6] ''جو کچھ ان چارپایوں کے پیٹوں میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے۔'' ایسا ہی ﴿لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ [الأعراف: 32:7] ''دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے قیامت کے دن خالص (ان کے لیے)۔'' یعنی قیامت کے دن کافر ان کے ساتھ ان نعمتوں میں شریک نہ ہوں گے اور یہاں معنی ہیں کہ ہم نے انہیں دار یعنی دار آخرت کے ذکر سے خالص کیا ہے۔ اور اَخْلَصْنٰهُمْ کے معنی ہیں کہ ہم نے انہیں اس کے لیے یعنی دار آخرت کے لیے خالص بنایا ہے کیونکہ وہ دار آخرت کو یاد دلاتے ہیں۔ اور یہ انبیاء کی شان ہے اور یا یہ مطلب ہے کہ وہ آخرت اور رجوع الی اللہ کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ (ل) اور یا باب سبب کے لیے ہے یعنی ایک خالص خصلت کی وجہ سے جو ﴿ذِكْرَى الدَّارِ﴾ ہے انہیں خالص بنایا ہے۔

2851- ﴿الْاَخْيَارِ﴾ خَيْرٌ اور شَرٌّ کا استعمال دو طرح پر ہے۔ ایک اسم کے طور پر جیسے ﴿مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ [البقرة: 215:2] ''جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو۔'' ﴿اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا﴾ [النور: 33:24] ''اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو۔'' ﴿يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ [آل عمران: 104:3] ''جو بھلائی کی طرف بلائیں۔'' اور دوسرا وصف کے طور پر اور اس وقت ان کی تقدیر [اَفْعَلَ مِنْهُ] پر ہوتی ہے۔ جیسے [هٰذَا خَيْرٌ مِنْ ذَاكَ] اسی کے مطابق ہی ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ﴾ [البقرة: 106:2] ''تو اس سے بہتر لے آتے ہیں۔'' ﴿اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرة: 184:2] ''روزے رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے۔'' جہاں اسم یا وصف مراد ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی ﴿فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ [البقرة: 197:2] ''البتہ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔'' اور ﴿خَيْرٰتٌ حِسَانٌ﴾ [الرحمٰن: 70:55] ''اچھی خوب صورت (عورتیں) ہوں گی۔'' میں اصل خَيِّرَاتٌ ہے اور خَيِّرٌ فضیلت والا ہے جو خیر سے مختص ہو اور تخفیف کر کے کہا جاتا ہے [رَجُلٌ خَيِّرٌ وَامْرَأَةٌ خَيِّرَةٌ] اور خَيِّرَاتٌ سے مراد ہیں

هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾

یہ نصیحت ہے اور متقیوں کے لیے اچھا ٹھکانا ہے۔(2852)

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿۵۰﴾ ۚ

ہمیشگی کے باغ (جن کے) دروازے ان کے لیے کھولے گئے ہیں۔

مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّ شَرَابٍ ﴿۵۱﴾

ان میں تکیے لگائے ہوئے ہوں گے۔ان میں بہت سے پھل اور پینے کی چیزیں بھی منگوائیں گے۔

وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾

اوران کے پاس نیچی نگاہوں والی ہم عمر ہوں گی۔(2853)

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾

یہ وہ ہے جن کا تمہیں حساب کے دن کے لیے وعدہ دیا جاتا تھا۔

الثلاثة

مُخْتَارَاتٌ یعنی چنی ہوئی یا برگزیدہ جن میں کوئی عیب نہیں۔ (غ) اَخْیَارٌ یہاں اسی معنی میں خَیِّرٌ کی جمع ہے اور مُصْطَفَیْنَ، مُصْطَفٰی کی جمع ہے۔[دیکھو نمبر: 165]

2852- ﴿هٰذَا ذِكْرٌ﴾ میں اشارہ اس کی طرف ہے جو گزر چکا یعنی یہ ان کی بزرگی اور عظمت کا اظہار ہے جو اس دنیا میں ہوتا ہے۔اور ذکر بمعنی شرف آتا ہے اور یا مطلب یہ ہے کہ یہ گزشتہ انبیاء کا ذکر ہے اور آگے فرمایا جواب تقویٰ اختیار کریں، ان کے لیے بھی اچھا مآب ہے۔

2853- ﴿اَتْرَابٌ﴾ تُرَابٌ مٹی۔﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾[الروم: 20:30] ''تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔'' ﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾[النبأ: 40:78] ''کاش میں مٹی ہوتا۔'' اور تِرِبَ کے معنی ہیں مٹی سے مل گیا یا فقیر ہو گیا۔﴿اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝﴾[البلد: 16:90] ''یا مٹی سے ملے ہوئے مسکین کو۔'' یعنی فقر کی وجہ سے مٹی سے ملا ہوا۔اور تَرِيْبَةٌ پسلی کو کہتے ہیں اور اس کی جمع تَرَائِبُ ہے ﴿مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ ۝﴾[الطارق: 7:86] ''پیٹھ اور پسلیوں کے بیچ سے۔'' اور تِرْبٌ جس کی جمع اَتْرَابٌ ہے۔ہمزاد کو کہتے ہیں یعنی ساتھ پیدا ہوا ہوا اور یہ اکثر مؤنث پر بولا جاتا ہے اور ﴿اَتْرَابٌ﴾ کی تفسیر ثعلب نے اَمْثَالٌ سے کی ہے یعنی ان کی مثل اور یہ پسندیدہ ہے اس لیے کہ وہاں ولادت کوئی نہیں۔

بہشت میں عورتوں کے ہونے پر[دیکھو نمبر: 2785] اور ﴿قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾[الصافات: 48:37] ''نیچی نگاہوں والی۔'' کی تشریح بھی وہیں گزر چکی ہے اور اَتْرَابٌ بھی انہیں کہا ہے۔یعنی وہ ساتھ پیدا ہوئی ہوئی ہیں۔ظاہر ہے کہ مراد اس سے اہل جنت کے

اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾	یہ ہمارا (دیا ہوا) رزق ہے جو ختم نہ ہوگا۔
هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾	یہ (متقیوں کے لیے ہے) اور سرکشوں کے لیے بہت برا ٹھکانا ہے۔
جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾	(یعنی) جہنم اس میں داخل ہوں گے، سو وہ بری جگہ ہے۔
هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّ غَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾	یہ، پس چاہیے کہ اسے چکھیں ابلتا ہوا اور حد سے زیادہ ٹھنڈا پانی ہے۔ (2854)
وَّ اٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾	اور اسی صورت کی اور (سزا) رنگا رنگ کی (موجود ہے)۔
هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ	یہ ایک فوج ہے جو تمہارے ساتھ اندھا دھند داخل ہونے

ساتھ پیدا ہوئی ہیں اور اہل جنت کی ولادت سے ان کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا مراد نہیں۔ بلکہ ان کی وہ ورحانی پیدائش مراد ہے جو انہیں اہل جنت بناتی ہے۔ گویا ان نعمائے جنت کی پیدائش اعمال صالحہ کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

2854- ﴿غَسَّاقًا﴾ غَسَّاقٌ۔ غَسَقَ کے لیے [دیکھو نمبر: 1865] [غَسَقَتْ عَيْنُهُ] کے معنی ہیں اس کی آنکھ سے آنسو بہے۔ اور [غَسَقَ الْجُرْحُ] زخم سے زرد پانی بہا اور غَاسِقٍ رات کو کہتے ہیں۔ اور زجاج کا قول ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ رات دن کی نسبت ٹھنڈی ہوتی ہے اور غَاسِقٌ کے معنی بَارِدٌ یعنی ٹھنڈ ہیں۔ اور ﴿غَسَّاقًا﴾ کے معنی تین طرح پر کیے گئے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کے معنی زمہریر مروی ہیں یعنی سخت ٹھنڈا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ پانی ہے جو دوزخیوں کے زخموں سے بہے گا اور ایک قول ہے کہ اس سے مراد ان کے آنسو ہیں جو آنکھوں سے بہیں گے۔ اور پہلے قول کے مطابق ایک قول ہے کہ ﴿غَسَّاقًا﴾ بدبودار سخت ٹھنڈا ہے جس کی ٹھنڈک ابلتے ہوئے پانی کی حرارت کی طرح جلا دیتی ہے۔ (ل) اور حَمِيْمٌ یا ابلتے ہوئے پانی کے مقابل پر سخت ٹھنڈا زیادہ موزوں معنی بھی ہیں۔ جیسے دوسری جگہ ہے ﴿لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا﴾ [الدھر: 13:76] ''نہ اس میں دھوپ (کی حدت) دیکھیں گے اور نہ سخت سردی۔'' اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے قویٰ کو اعتدال پر نہیں رکھا یا افراط کی طرف نکل گئے یا تفریط کی طرف اسی طرح ان کی غذا بھی یا حد سے زیادہ گرم ہوگی یا حد سے زیادہ سرد۔ ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ [النبأ: 26:78] ''بدلہ موافق (اعمال ہے)۔''

لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾

والی ہے۔ان کے لیے فراخی نہیں کیونکہ وہ آگ میں داخل ہونے والے ہیں۔ (2855)

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ؕ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾

کہیں گے بلکہ تم (ایسے ہو) تمہارے لیے کوئی فراخی نہیں، تم نے اسے ہمارے لیے پہلے بھیجا۔سو کیا ہی بری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿۶۱﴾

کہیں گے اے ہمارے رب! جس نے اسے ہمارے لیے آگے بھیجا تو اس کے لیے آگ میں عذاب کو دو چند بڑھا۔

وَ قَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾

اور کہیں گے ہمیں کیا ہوا ہم ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جنہیں ہم شریروں میں سے گنتے تھے۔

اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾

کیا ہم ان کی ہنسی اڑاتے تھے یا (ہماری) آنکھیں ان سے پھر گئی ہیں۔ (2856)

2855- ﴿مُّقْتَحِمٌ﴾ قَحْمٌ بہت بوڑھا اور [قَحَمَ فِي الْاَمْرِ] اور اِقْتَحَمَ کے معنی ہیں اپنے آپ کو بغیر فکر و اندیشہ کے ڈال دیا۔ یا بلا سوچے سمجھے۔(ل) یا اِقْتِحَامٌ کے معنی ہیں کسی ڈرانے والی سختی میں گھس جانا ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝﴾ [البلد: 11:90] ''سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔'' (غ)

﴿مَرْحَبًا﴾ [دیکھو نمبر: 1385] اور آنے والے کو بطور دعا کہا جاتا ہے [اَهْلًا وَ مَرْحَبًا] یعنی تو اہل میں آ گیا اور فراخی میں آ گیا۔ اور مَرْحَبًا سے مراد ہے [اَنْزِلْ فِي الرَّحْبِ وَالسَّعَةِ] فراخی اور وسعت میں ٹھہر اور نصب بوجہ فعل محذوف ہے۔(ل)

﴿فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ﴾ اندھا دُھند داخل ہونے والی فوج سے مراد وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے پیچھے چل کر اور اپنی عقل سے کام نہ لے کر گمراہ ہوئے یعنی اتباع۔ اور ﴿لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ﴾ متبوع سرداروں کی ان مقلدوں کے لیے دعا ہے۔

2856- پہلی آیت میں اور یہاں اشارہ مومنوں کی طرف ہے یعنی ہم تمسخر کر کے ان کی تحقیر کرتے اور انہیں برا کہتے تھے۔ یا وہ کہیں آگ میں ہی ہیں اور ہم انہیں دیکھتے نہیں۔

ع 4 24 13

اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾	یہ دوزخ والوں کاایک دوسرے سے جھگڑنا یقیناً سچ ہے۔
قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾	کہہ، میں صرف ڈرانے والا ہوں اور سوائے اللہ کیلئے فوقیت والے کے کوئی معبود نہیں۔
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾	آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، غالب بخشنے والا۔
قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾	کہہ، یہ ایک عظیم الشان خبر ہے۔ (2857)
اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾	تم اس سے منہ پھیر رہے ہو۔
مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾	مجھے اعلیٰ درجہ کے سرداروں کا کوئی علم نہیں۔ جب وہ جھگڑتے ہیں۔ (2858)

2857- ﴿هُوَ﴾ میں اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے اور یا وہ چیز جس سے ڈرایا جاتا ہے۔

2858- حدیث میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نماز فجر میں بہت دیر سے آئے۔ پھر آپ ﷺ نے نماز پڑھا کر فرمایا کہ میں آج رات اٹھا اور نماز پڑھی اور پھر نماز میں اونگھ آگئی یہاں تک کہ میں جاگ اٹھا پھر میں نے اپنے رب کو احسن صورت پر دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد! کیا تو جانتا ہے کہ **ملاء اعلیٰ کس بارے میں جھگڑتے ہیں؟** میں نے کہا نہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی تو میرے لیے ہر چیز روشن ہوگئی اور میں نے پہچان لیا۔ تب فرمایا اے محمد! کیا تو جانتا ہے کہ ملاء اعلیٰ کس بارے میں جھگڑتے ہیں؟ میں نے کہا کفاروں کے بارے میں۔ کہا کفارے کیا ہیں؟ میں نے کہا جماعت کی طرف قدم اٹھا کر جانا اور نماز کے بعد مسجدوں میں بیٹھنا اور مشکلات کے وقت وضو کو پورا کرنا۔ کہا اور درجات کیا ہیں؟ میں نے کہا کھانا کھلانا اور کلام میں نرمی کرنا اور نماز پڑھنا جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ فرمایا مانگ۔ میں نے کہا میں تجھ سے نیکیوں کا کرنا اور منکرات کا ترک اور مسکینوں کی محبت مانگتا ہوں اور یہ کہ تو میری حفاظت فرمائے اور مجھ پر رحم کرے۔ اور جب تو کسی قوم کو فتنہ میں ڈالنا چاہے تو مجھے بغیر فتنہ کے ڈالنے کے وفات دیجیو اور میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اس کی محبت جو تجھ سے محبت کرے اور اس عمل کی محبت جو مجھے تیری محبت سے قریب کرے، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ حق ہے اسے پڑھو اور سیکھو۔ اور یہ مشہور خواب کی حدیث ہے اور جو اسے جاگتے میں سمجھتا ہے وہ غلطی کرتا ہے۔ (ث)

اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۰

میری طرف سوائے اس کے کچھ وحی نہیں کیا جاتا کہ میں صرف ڈرانے والا ہوں۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝۷۱

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں۔[2859]

خواب میں رؤیت باری تعالیٰ:

لیکن مفسرین کے نزدیک اس حدیث میں جس اختصام کا ذکر ہے وہ اس آیت قرآنی میں مذکور نہیں (اور خواب میں جو تمثلات انسان کو دکھائے جاتے ہیں ان سے بعض وقت سطحی نظر کے لوگ ٹھوکر کھا کر اعتراض کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفت تو ہے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾[الشوریٰ: 11:42] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' لیکن خواب میں جو کچھ اللہ تعالیٰ دکھاتا ہے وہ دوسرے عالم کی بات ہوتی ہے اور علیحدہ حواس ہوتے ہیں۔ ورنہ سچ مچ اللہ تعالیٰ انسان کی صورت پر متمثل نہیں ہوتا) مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں ملاء اعلیٰ کا وہ اختصام مراد ہے جو آدم کے خلیفہ بناتے وقت انہوں نے کیا۔ گویا فرشتے کہتے تھے کہ آدم کو خلیفہ نہ بنایئے۔ مگر جیسا تفصیل سے دوسری جگہ بیان ہو چکا یہ بات درست نہیں کہ فرشتوں نے آدم کے خلیفہ بنانے پر کوئی جھگڑا اللہ تعالیٰ سے کیا ہو اور یہاں ﴿يَخْتَصِمُوْنَ﴾ میں ضمیر کفار کی طرف جاتی ہے۔ اور بتانا یہ مقصود ہے کہ جس بات سے ڈرایا جاتا ہے وہ تو آ کر رہے گی۔ لیکن کب آئے گی؟ اس کا مجھے علم نہیں، اس کا علم ملاء اعلیٰ کو ہے۔ یعنی ان فرشتوں کو جن پر اللہ تعالیٰ اپنے رازوں کا اظہار فرماتا ہے۔ پیغمبر پر سارا علم غیب ظاہر نہیں کیا جاتا اور ﴿نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ سے جو آگے آتا ہے اور ﴿مُنْذِرٌ﴾ سے جو شروع رکوع میں ہے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اور **حدیث ملاء اعلیٰ میں اختصام کا ذکر** ہے تو اس کی کیفیت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ ملاء اعلیٰ خدا سے جھگڑتے ہیں کیونکہ وہ ﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ﴾ [التحریم: 6:66] ''اللہ جو حکم انہیں دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔'' کے مصداق ہیں۔ اور نہ یہ مراد ہو سکتی ہے کہ وہ باہم جھگڑتے ہیں یعنی بعض کہتے ہیں کہ یہ ثواب کا کام ہے اور بعض یہ کہ یہ نہیں۔ بلکہ مراد اس سے صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس سے تعلق ہے اور دوسری طرف خدمت مخلوق۔ تو اِخْتِصَامٌ سے مجازی رنگ میں مراد یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس بات کو دوسری پر فضیلت ہے۔ گویا یہ دونوں باتیں ایسی اعلیٰ درجے کی ہیں کہ ملاء اعلیٰ بھی نہیں جانتے کہ کس کو ان میں سے دوسری پر فضیلت دیں۔

2859- یہ مضمون پہلے بیان ہو چکا ہے مگر یہاں اسے لانے کی غرض یہ ہے کہ شیطان کا راست بازوں کی مخالفت کرنا قدیم قانون ہے۔ مگر شیطان اور اس کے نمائندے آخر کار مغلوب ہوتے ہیں۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾

سو جب میں اس کی تکمیل کر دوں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو اس کے لیے فرمانبرداری کرتے ہوئے گر جاؤ۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾

تو سب فرشتوں کُل کے کُل نے فرمانبرداری کی۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

مگر ابلیس (نے نہ کی)، اس نے تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾

کہا، اے ابلیس! کس چیز نے تجھے روکا کہ تو اس کی فرمانبرداری کرتا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے؟ کیا تو نے تکبر کیا یا تو عالی مرتبہ (لوگوں) میں سے ہے۔ (2860)

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾

اس نے کہا، میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۖ ﴿۷۷﴾

کہا تو اس (حالت) سے نکل جا، کیونکہ تو دور کیا گیا ہے۔

وَّ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾

اور تجھ پر میری لعنت قیامت کے دن تک ہے۔

2860 - **انسان کو دو ہاتھوں سے پیدا کرنے میں اشارہ:** یدی یا دونوں ہاتھوں سے کیا مراد ہے؟ اس کی ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ جس کام کی طرف خاص توجہ ہو اسے دونوں ہاتھوں سے انجام کو پہنچایا جاتا ہے۔ تو گویا مطلب یہ ہے کہ جسے میں نے ایک خصوصیت دے کر پیدا کیا ہے۔ اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ بطور تاکید ہے جیسے ﴿ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ﴾ [الملك: 4:67] ''نظر کو بار بار لوٹا'' اور بعض نے کہا کہ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس میں قوائے ملکوتی اور قوائے حیوانی جمع کیے گئے ہیں اور یہ آخری توجیہ لطیف ہے۔ اور ﴿اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ﴾ سے یہ مراد ہے کہ فی الواقع تو بلند مرتبہ والوں میں سے ہے اور یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ شیطان کا تعلق سفلی یا حیوانی خواہشات سے ہے نہ اعلیٰ یا ملکوتی صفات سے۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾	کہا میرے رب! تو مجھے اس دن تک مہلت دے جب وہ اٹھائے جائیں۔
قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾	کہا تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی۔
اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾	اس دن تک جس کا وقت معلوم ہے۔
قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾	کہا، تو تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔
اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾	سوائے ان میں سے تیرے خالص بندوں کے۔
قَالَ فَالْحَقُّ ۫ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾	کہا تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں۔
لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾	میں ضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب سے جو تیری پیروی کریں بھر دوں گا۔
قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۶﴾	کہہ، میں تم سے اس پر اجر نہیں مانگتا اور میں بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ (2861)
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾	یہ صرف جہانوں کے لیے بزرگی (کا موجب) ہے۔
وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾ ع 5 24 14	اور تم ضرور اس کی خبر کو ایک وقت کے بعد جان لو گے۔

2861- ﴿الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾ مُتَكَلِّفٌ۔ كَلَفٌ۔ اصل میں وہ چیز ہے جو چہرہ پر ظاہر ہو جاتی ہے جیسے تل۔ اور كَلَفٌ اور كُلْفَةٌ سرخی اور سیاہی ملی ہوئی یا سیاہی ہے جو چہرہ پر ظاہر ہو جائے اور جلد کے رنگ کو بدل دے۔ (ل) اور تکلف وہ ہے جسے انسان کرے درآنحالیکہ اس کے چہرہ پر كَلَفٌ کا اظہار ہو اور اس کے ساتھ اس کے کرنے میں اسے مشقت بھی کرنی پڑے۔ پھر كُلْفَةٌ عرف میں مشقت کا نام ہو گیا ہے اور تکلف اس کا نام ہے جو مشقت سے یا بناوٹ سے کیا جائے۔ اس لیے تَكَلُّفٌ دو طرح پر ہے۔ ایک قابل تعریف اور وہ یہ ہے کہ انسان اس کا قصد کرے اور اس کی غرض یہ ہو کہ وہ امر اس پر آسان ہو جائے اور اس سے اس کو محبت پیدا ہو جائے۔ اسی لحاظ سے تکلیف کا استعمال عبادات میں ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ انسان دوسروں کو دکھانے کے لیے اس کا قصد کرے اور اسی معنی میں یہاں مُتَكَلِّفٌ ہے اور حدیث میں بھی ہے [اَنَا وَ أَتْقِيَاءُ أُمَّتِيْ بَرَاءٌ مِنَ التَّكَلُّفِ] (المفردات فی غریب القران، کتاب الخاء، جلد1، صفحہ439) میں اور میری امت کے متقی تکلف سے بیزار ہیں۔

سورۃ الزمر

نام:

اس سورت کا نام اَلزُّمَر ہے اور اس میں 8 رکوع اور 75 آیات ہیں۔ سورت کا نام دو گروہوں یعنی مومنوں اور کافروں کے گروہوں سے لیا گیا ہے جن کا ذکر اس سورت میں ہے۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی ضرورت بیان کی ہے۔

② دوسرے میں فرمانبرداری کرنے والوں کے اجر اور نافرمانوں کی سزا کا مقابلہ کیا ہے۔

③ تیسرے میں فرمانبرداری اور نافرمانی کے نتائج بتائے ہیں۔

④ چوتھے میں نافرمانوں کی سزا کا ذکر ہے۔

⑤ پانچویں میں یہ کہ وہ سزا ٹل نہیں سکتی۔

⑥ چھٹے میں رحمت الٰہی کی وسعت کو بیان کر کے کہ وہ سب گناہ بخشنے کو تیار ہے۔

⑦ ساتویں میں حساب کتاب اور

⑧ آٹھویں میں ہر دو فریق کے آخری ٹھکانے کا ذکر ہے۔

تعلق اور زمانۂ نزول:

پچھلی سورت میں مومنوں کو بتایا تھا کہ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مصائب کو برداشت کریں اور ان میں صدق دکھائیں۔ اب یہاں ان دونوں گروہوں کا مفصل ذکر کیا ہے یعنی ایک وہ گروہ جو حق کو پھیلانے کے لیے کھڑا کیا گیا ہے اور دوسرا وہ جو حق کو قبول نہیں کرتا بلکہ اس کی مخالفت پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ زمانہ نزول وہی ہے جو اس مجموعہ کی باقی سورتوں کا۔

اٰیَاتُهَا 75 (39) سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ (59) رُكُوْعَاتُهَا 8

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①

یہ کتاب اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے اتاری گئی ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ②

ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے سو اللہ کی ایسی عبادت کر کہ فرمانبرداری صرف اسی کی ہو۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ③

وقف لازم

سنو خالص فرمانبرداری اللہ کے لیے ہی ہے اور جو لوگ اس کے سوائے ولی بناتے ہیں (کہتے ہیں کہ) ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے نزدیک کر دیں۔ اللہ ان کے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اللہ اسے منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا جو جھوٹا ناشکر گزار ہے۔ (2862)

2862- ﴿لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اپنے مال لوگوں کو دیتے ہیں تاکہ ہماری شہرت ہو اور تاکہ ہمیں اجر ملے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کسی چیز کو قبول نہیں کرتا سوائے اس کے جو خالص اس کے لیے ہو۔ پس یہاں سکھایا ہے کہ **نیکی کرنا محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو** نہ اس لیے کہ اس پر کچھ اجر ملے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہونے سے یہ مراد ہے کہ اسے اپنا فرض سمجھ کر کیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمے رکھا ہے۔ نیکی کرنا درحقیقت فرائض انسانی میں سے ایک فرض ہے اور یہ دین اسلام کی سب سے پہلی تعلیم ہے۔ یہی توحید کامل ہے اور کسی اور غرض کو مدنظر رکھ کر کام کرنا شرک کا ایک باریک پہلو ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ ہی **غیر اللہ کی عبادت کا ذکر** کیا جو موٹی قسم شرک کی ہے اور بتایا ہے کہ بت پرست بھی یہی عذر کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے بت پرستی کرتے ہیں۔ یہ عذر بہت سے پیر پرستوں کا بھی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان پیروں کی وساطت سے ہمیں خدا کے دربار میں رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اور بعض

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۴

اگر اللہ چاہتا کہ بیٹا بنائے تو وہ اپنی مخلوق سے جسے چاہتا چن لیتا۔ بے عیب ذات ہے وہ اللہ اکیلا سب کے اوپر ہے۔ (2863)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝۵

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے، ہر ایک وقتِ مقرر کے لیے چلتا ہے۔ سنو وہ غالب بخشنے والا ہے۔ (2864)

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ

تمہیں ایک ہی اصل سے پیدا کیا، پھر اسی سے اس کا جوڑا

بت پرست یہ کہتے ہیں کہ ہم صرف تصور جمانے کی خاطر بتوں کو سامنے رکھتے ہیں۔ درحقیقت ان سب باتوں کا ماحصل وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کیا۔ باطل پرستی کبھی حق پرستی تک نہیں پہنچا سکتی۔

2863- **عقیدۂ ابنیت:** یہاں عیسائی عقیدہ کی تردید کی ہے کیونکہ سب سے بڑا شرک یہی ہے۔ عیسائی باپ، بیٹے اور روح القدس کی ایک ذات کے تین اقنوم قرار دیتے ہیں۔ ﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ ﴿الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ کہہ کر بتایا کہ یہ تو ہو سکتا ہی نہیں اور ﴿لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ﴾ اس لیے فرمایا کہ ارادہ الٰہی تو کسی ضرورت پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اگر جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں فی الواقع یہ ضرورت بھی ہوتی کہ خدا کا کوئی بیٹا ہو تو پھر بھی اس کی ذات میں شرک نہ ہو سکتا تھا بلکہ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنانے کے لیے چن لیتا۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ **اللہ تعالیٰ کے کلام میں جو پہلے انبیاء سے ہوا اگر کہیں بیٹے کا لفظ آیا ہے** تو محض اس معنی سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ ہے، کیونکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر لے لیتے ہیں۔ وہ ایک گونہ مشابہت (اللہ کی ذات اس لفظ کے عام معنی میں مشابہت اور مماثلت سے پاک ہے) اللہ تعالیٰ سے پیدا کر لیتے ہیں اور یوں مجاز کے طور پر نہ حقیقت کے رنگ میں ان پر بیٹے کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔

2864- ﴿يُكَوِّرُ﴾ کَوْر ایک چیز کا لپیٹنا اور اس کے بعض کا بعض سے ملانا ہے۔ جیسے پگڑی کا سر پر لپیٹنا۔ اور رات اور دن کی تَکْوِیْر میں ان کی کمی بیشی کی طرف اشارہ ہے۔ (غ)

مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶

بنایا اور تمہارے لیے چار پایوں کے آٹھ جوڑے اتارے۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے۔ پیدائش کے بعد پیدائش ہے تین اندھیروں میں۔ یہ اللہ تمہارا رب ہے اسی کی بادشاہت ہے، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کس طرح پھر جاتے ہو۔ (2865)

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۫ وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷

اگر تم ناشکری کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔ اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کرتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تمہارے رب کی طرف تمہارا لوٹ کر جانا ہے۔ پس وہ تمہیں اس کی خبر دے گا جو تم کرتے تھے۔ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ

اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے رب کو اس کی طرف رجوع کرتا ہوا پکارتا ہے۔ پھر جب وہ اسے اپنی طرف سے

2865- ﴿اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ﴾ صاف بتاتا ہے کہ انزال کے معنی لازماً اوپر سے اتارنا نہیں بلکہ ایک شے کے اسباب مہیا کرنا ہیں [دیکھو نمبر: 14] اور یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ نے چار پایوں کو جنت میں پیدا کیا پھر وہاں سے اتارا، صحیح نہیں۔ (ر)

اور **تین اندھیروں سے مراد** پیٹ، رحم اور مشیمہ کے پردے لیے گئے ہیں۔ اور بعض نے پیٹھ اور پیٹ اور رحم کی ظلمت مراد لی ہے۔ (ر) مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری پہلی پیدائش بھی تمہاری نظروں سے مخفی تیار ہوتی ہے تو دوسری پیدائش اگر تمہاری نظروں سے مخفی ہے تو تعجب کیوں کرتے ہو۔

نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝۸

نعمت عطا کرتا ہے اسے بھول جاتا ہے جس کے لیے (اسے) پہلے پکارتا تھا اور اللہ کے لیے ہمسر بناتا ہے تاکہ اس کے رستے سے (لوگوں کو) گمراہ کرے۔ کہہ، اپنی ناشکری سے تھوڑا فائدہ اٹھالے تُو آگ والوں میں سے ہے۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۹ ع 1 9 15

کیا وہ جو رات کے وقتوں میں سجدہ کرکے اور کھڑا ہو کر فرماں برداری کرنے والا ہے آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے (نافرمان کے برابر ہے)۔ کہہ، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟ صرف خالص عقل والے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰

کہہ، اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے رب کا تقویٰ کرو۔ جو لوگ بھلائی کرتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور اللہ کی زمین فراخ ہے۔ صابروں کو ان کا اجر ضرور بے حساب ملے گا۔ (2866)

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۱۱

کہہ، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس کے لیے فرمانبرداری کو خالص کرتا ہوا کروں۔

2866- ﴿يٰعِبَادِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایتاً قول ہے کہ یہاں نیکی کرنے والوں کو اس دنیا میں بھلائی کا وعدہ دیا ہے اور ﴿اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ ایک جگہ حق کے قبول کرنے سے روکا جاتا ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ اور یہ ہجرت کی طرف اشارہ ہے۔ اور صَابِرٌ کے لفظ میں بھی صاف بتادیا کہ اللہ کی راہ میں بڑے بڑے دکھ بھی اٹھانے پڑیں گے، مگر آخر کار کامیابی ہے۔

وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲﴾

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے بڑھ کر فرمانبردار بنوں۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳﴾

کہہ، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (2867)

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ﴿۱۴﴾

کہہ، میں اللہ کی ہی اس کے لیے اپنی فرمانبرداری کو خالص کرتا ہوا عبادت کرتا ہوں۔

فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۵﴾

تو تم اس کے سوائے جس کی چاہو عبادت کرو۔ کہہ، گھاٹے میں رہنے والے وہ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو گھاٹے میں رکھا۔ دیکھو یہی کھلا گھاٹا ہے۔

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾

ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے (ایسے ہی) سائبان۔ اس کے ساتھ اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اے میرے بندو! تم میرا تقویٰ اختیار کرو۔ (2868)

2867- ﴿اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ اس میں بتایا کہ سکھ صرف فرمانبرداری سے ملتا ہے۔ اگر سید البشر کے منہ سے بھی یہ لفظ کہلوائے گئے ہیں تو آج مسلمان اللہ تعالیٰ کے قوانین کی نافرمانی کر کے کس طرح سکھ کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ ﴿اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ میں اور یہاں اصل الاصول یہ ہے کہ قانون الٰہی کی کامل فرمانبرداری ہو۔

2868- گویا آگ ہی اوپر ہوگی اور آگ ہی نیچے یعنی چاروں طرف سے احاطے کئے ہوئے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ دوزخ میں مکان کی کیفیت وہ نہیں جو یہاں ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ﴿۱۷﴾

اور وہ جو طاغوت کی عبادت سے بچتے ہیں اور اللہ کی طرف جھکتے ہیں ان کے لیے خوش خبری ہے۔ سو میرے بندوں کو خوش خبری دو۔

الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾

وہ جو بات کو سنتے ہیں پھر اس کی اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ (تعالیٰ) نے ہدایت دی ہے اور یہی خالص عقل والے ہیں۔ (2869)

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَیْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِی النَّارِ ﴿۱۹﴾ ۚ

تو کیا وہ جس پر عذاب کا فتویٰ سچ ثابت ہوا، سو کیا تو اسے بچا سکتا ہے جو آگ میں جا رہا ہے۔ (2870)

لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِیَّةٌ ۙ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِیْعَادَ ﴿۲۰﴾

لیکن وہ لوگ جو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے بلند مقامات ہیں ان کے اوپر (اور) بلند مقامات بنے ہوئے ہیں۔ (2871) ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اللہ نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے۔ اللہ وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔

2869- یا تو ﴿قَوْلَ﴾ عام ہے اور مطلب یہ ہے کہ بری باتوں کے پیچھے نہیں لگتے، اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ اور یا ﴿قَوْلَ﴾ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اس میں اگر بدلہ لینے کی اجازت ہے تو اس سے بہتر یہ بھی ہے کہ عفو کیا جائے۔ پس وہ اعلیٰ درجہ کی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔

2870- یعنی جو آگ کی طرف چلا جا رہا ہے پیغمبر اسے جبراً نہیں بچا سکتا۔

2871- اس میں اشارہ **جنت کی ترقیات غیر متناہی** کی طرف ہے۔ کتنے بھی بلند مقام پر پہنچ جائیں اس سے آگے اور بلند مقامات ہوں گے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾ ع

کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ آسمان سے پانی اتارتا ہے، پھر اسے چشمے بنا کر زمین میں چلاتا ہے، پھر اس کے ساتھ کھیتی اگاتا ہے جس کے مختلف رنگ ہیں، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے۔ تب تو اسے زرد دیکھتا ہے پھر وہ اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔ اس میں عقل والوں کے لیے نصیحت ہے۔ (2872)

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾

بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر ہے۔ (کیا وہ تاریکی میں رہنے والے کی طرح ہے)، سو ان پر افسوس جن کے دل اللہ کے ذکر کے مقابلہ میں سخت ہیں۔ وہ کھلی گمراہی میں ہیں۔ (2873)

2872- ﴿يَهِيْجُ﴾ هَاجٌ (مصدر هِيْجَانٌ) ایک چیز ضرر یا مشقت کی وجہ سے اٹھی۔ اور هَيَّجَ اسے اٹھایا یا اکسایا۔ اور سبزی کے متعلق هَاجٌ کہا جاتا ہے جب وہ خشک ہو جائے اور زرد پڑ جائے۔ اور زمین کو بھی هَائِجٌ کہا جاتا ہے جس کی سبزی زرد پڑ جائے۔ (ل)

﴿حُطَامًا﴾ حَطْمٌ۔ هَشْمٌ کی طرح کسی چیز کا توڑنا ہے ﴿لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ﴾ [النمل: 18:27] ''سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل نہ ڈالیں۔'' اور حُطَمَةٍ دوزخ کا نام ہے ﴿لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ﴾ [الهمزة: 4:104] ''وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔'' اور حُطَامٌ وہ ہے جو خشک ہو کر چورا چورا ہو جائے۔ (غ)

2873- ﴿قٰسِيَةً﴾ قَسْوَةٌ ہر چیز میں صلابت یا سختی کو کہتے ہیں اور زمین کو قَاسِيَةٌ کہا جاتا ہے جب اس میں کوئی سبزی نہ اگتی ہو اور رات کو قَاسِيَةٌ کہا جاتا ہے جب سخت تاریک ہو اور دل کی قَسْوَةٌ یہ ہے کہ رحمت اور نرمی اور خشوع اس سے جاتے ہیں۔ (ل)

﴿مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ مِنْ یہاں یا بمعنی عَنْ ہے اور یا تعلیل کے لیے۔ یعنی اللہ کے ذکر کی وجہ سے گویا جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ (مغنی)

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے (یعنی) کتاب جس کی باتیں ملتی جلتی دہرائی گئی ہیں۔ اس سے ان لوگوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور ان کے دل اللہ (تعالیٰ) کے ذکر کے لیے نرم ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے وہ اس کے ساتھ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے اللہ گمراہ ٹھہرائے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ (2874)

2874- ﴿تَقْشَعِرُّ﴾ قُشَعْرِيرَةٌ کانپنے کو کہتے ہیں اور [اَقْشَعَرَّ جِلْدُ الرَّجُلِ] یعنی اس کا چمڑا یا بدن کانپ اٹھا اور حدیث عمر میں ہے کہ ہند نے انہیں کہا جب ابوسفیان کو درہ سے مارا [لَرُبَّ يَوْمٍ لَوْ ضَرَبْتَهُ لِاَقْشَعَرَّ بِكَ بَطْنُ مَكَّةَ] (کنزالعمال فی سنن اقوال، جلد12، صفحہ667، حدیث:36018) بہت وقت ایسے گزرے ہیں کہ اگر تو اسے مارتا تو وادیٔ مکہ کانپ اٹھتی۔ (ل) پس اَقْشَعْرَارٌ سے مراد لازماً یہ نہیں کہ انسان سچ مچ کانپنے لگے بلکہ ایک خوف اور رعب کی حالت کا طاری ہو جانا بھی اَقْشَعْرَارٌ ہے۔

قرآن کے متشابہ اور مثانی ہونے سے مراد:

یہاں قرآن کو احسن الحدیث فرمایا۔ گویا دنیا میں کوئی کلام اس سے بہتر نہیں اور پھر اسے ﴿مُتَشَابِهٍ﴾ کہا ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 375] اور یہاں کل کتاب کو ﴿مُتَشَابِهٍ﴾ کہا ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی مثل ہے یعنی ایک دوسرے کے مؤید ہیں۔ یا مراد صحت معنی اور احکام اور مبنی علی الحق ہونے میں تشابہ ہے۔ اور اسے ﴿الْمَثَانِيَ﴾ کہا ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 1710] یعنی اس کے فوائد بار بار اور از سر نو تازہ ہوتے رہتے ہیں۔ یا اس لیے کہ اسے تلاوت میں دہرایا جاتا ہے۔ یا اس لیے کہ اس میں اصول دین کی ضروری باتوں کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔

قرآن یا کسی اور کلام کو سن کر اپنے آپ کو بیہوش بنانا یا تواجد کرنے لگنا ناجائز ہے:

اس سے خشیۃ اللہ رکھنے والوں کے چمڑے کانپ اٹھتے ہیں پھر ان کے چمڑے نرم ہو جاتے ہیں۔ کانپنا اور نرمی دونوں بلحاظ معنی ہیں۔ یعنی ایسی کیفیت ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے جیسا کانپنے والے کے اندر اور جیسے اس کے اندر جس کا چمڑا نرم ہو۔ یعنی وہ مرعوب ہو اور بات اس کے اندر اثر کر جائے۔ [وَ قِيْلَ هُوَ تَصْوِيْرُ لِلْخَوْفِ بِذِكْرِ اٰثَارِهٖ وَ تَشْبِيْهِ حَالَةٍ بِحَالَةٍ] (ر) اور بعض نے کہا ہے کہ عذاب کے ذکر پر کانپ اٹھتے ہیں اور رحمت کے ذکر پر نرم ہو جاتے ہیں۔ مگر اصل غرض

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ قِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾

بھلا وہ جو اپنے منہ کے ساتھ بڑے عذاب سے قیامت کے دن بچاؤ کرنا چاہے (اہل جنت کی طرح) اور ظالموں سے کہا جائے گا چکھو جو تم کماتے تھے۔ (2875)

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾

انہوں نے جو اِن سے پہلے تھے جھٹلایا، سو ان پر ایسی جگہ سے عذاب آیا جس کی انہیں کوئی خبر نہ تھی۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

وقف لازم

سو اللہ (تعالیٰ) نے انہیں دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب بڑا ہے۔ کاش وہ جانتے۔

صرف یہ ہے کہ کلام اللہ کی عظمت کا ان کے دلوں پر رعب ہوتا ہے اور وہ ان کے اندر اثر کرتی ہے۔ اور اگر ظاہر الفاظ کو بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عظمت کلام اللہ کے سامنے واقعی انسان کانپ اٹھے لیکن بیہوش ہو جانا یا تواجد کرنے لگنا یہ بناوٹ کی بدعات ہیں۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں میں نے اپنی دادی سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے کہا کہ بعض لوگ قرآن کریم کو سن کر بیہوش ہو جاتے ہیں تو انہوں نے فرمایا: [اَعُوْذُ بِاللّٰهِ تَعَالٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ] اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے ایسی ہی روایت ہے کہ میں نے اپنی والدہ سے ایسے لوگوں کا ذکر کیا کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تو کانپنے لگتے اور بیہوش ہو جاتے ہیں تو آپ نے فرمایا ان کے ساتھ مت بیٹھ۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو قرآن پڑھتے دیکھا ہے اور سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھی اور ان پر بھی یہ حالت طاری نہ ہوتی تھی۔ تو یہ لوگ ان سے زیادہ خشیۃ اللہ نہیں رکھتے۔ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا جو قرآن سن کر گر پڑا تو آپ نے فرمایا ہم تو نہیں گرتے ان لوگوں کے اندر شیطان گھس گیا ہے۔ مگر تعجب ان لوگوں پر ہے جو معمولی انسان کے کلام کو سن کر وجد کرنے لگتے ہیں اور بیہوش ہو جاتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جس بات کو قرآن کریم کے لیے بھی جائز نہیں سمجھا وہ غیر اللہ کے کلام کے سامنے وہ حالت بناتے ہیں۔

2875- ﴿يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ﴾ [اِتَّقٰى فُلَانٌ بِكَذَا] سے مراد ہوتی ہے کہ اسے اپنے نفس کے لیے حفاظت یا سپر بنایا اور یہاں اس عذاب کی شدت پر تنبیہ ہے جو انہیں پہنچے گا۔ گویا قیامت کے دن کے عذاب سے جس چیز کو وہ اپنے لیے بطور ڈھال بنائیں گے وہ ان کے منہ ہوں گے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا فرمایا ﴿وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾ [ابراهيم: 50:14] ''اور ان کے مونہوں کو آگ ڈھانک لے گی۔'' یا ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ﴾ [القمر: 48:54] ''جس دن آگ کے اندر اپنے مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے۔'' (غ) وَجْهٌ چونکہ اشرف اعضا ہے اس لیے مطلب یہ ہے کہ اشرف ترین مقام پر بدترین

وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾

قرآنِ عربی جس میں ٹیڑھا پن نہیں تا کہ وہ بچیں۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک آدمی ہے جس میں کئی (مالک) ایک دوسرے سے جھگڑنے والے شریک ہیں اور ایک آدمی جو پورے طور پر ایک آدمی کا (نوکر) ہے کیا ان دونوں کی حالت برابر ہے۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (2876)

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾

تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾ ع 3 10 17

پھر تم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس جھگڑا کرو گے۔

عذاب ہوگا۔

2876- ﴿مُتَشٰكِسُوْنَ﴾ شَكِسٌ (اور شَرِسٌ) بدخلق کو کہتے ہیں اور یہاں مراد ہے اپنی بدخلقی کی وجہ سے باہم جھگڑنے والے۔ (غ) اور کہا گیا ہے کہ جو لین دین وغیرہ میں بدخلق ہو اسے شَكِسٌ کہا جاتا ہے اور تَشَاكَسَ کے معنی ہیں ایک دوسرے کے مخالف ہوئے اور یہاں مراد ایک دوسرے کے مقابل کھڑا ہونے والے ہیں۔ اور تفسیر اس مثال کی یہ ہے کہ ایک شخص موحد ہے جو ایک ہی خدا کا پرستار ہے اور ایک کئی معبودوں کا پرستار ہے۔ (ل)

مَسَّ۔ ﴿سَلَمًا﴾ [سَلِمَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ] وہ اس کے لیے خالص ہوا۔ (ل)

موحد یا ایک خدا کے پرستار کے سامنے صرف ایک ہی بات ہوتی ہے یعنی اپنے ہر کام میں خدا کی خوشنودی کو مدنظر رکھنا۔ لیکن بہت معبودوں کا پرستار یا بہت لوگوں کی رضا کا طالب یا اپنی حرص و ہوا کا متبع کبھی ایک طرف جاتا ہے کبھی دوسری طرف۔